ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری
2004

مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات
سید جلال الدین عمری (دہلی)

خطاطی - اسلام کی نظر میں
مولانا محمد ارتقاء الحسن (کاندھلہ)

عبدالمطلب ہاشمی کا اصل نام
ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی (علی گڑھ)

قرآن مجید میں پرندوں سے استشہاد
ڈاکٹر مسعود عالم قاسمی (علی گڑھ)

تصوف اور احسان
حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا مودودی کا تقابلی مطالعہ
ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی (علی گڑھ)

فتاویٰ اور استنباط مسائل میں شدت کا رجحان
مفتی احمد نادر القاسمی (دہلی)

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ـــــــــ ستمبر ۲۰۰۴ء

مدیر
سید جلال الدین عمری
معاون مدیر
محمد رضی الاسلام ندوی

پان واٹ کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱
پوسٹ بکس ۹۳

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۲۳ شمارہ ۳

جمادی الاخریٰ ـــــــــ شعبان ۱۴۲۵ھ

جولائی ـــــــــ ستمبر ۲۰۰۴ء

زرِ تعاون

اندرون ملک ـــــــــ فی شمارہ ۲۵ روپے

ـــــــــ سالانہ ۱۰۰ روپے

ـــــــــ لائبریریاں وادارے سالانہ ۱۲۵ روپے

بیرون ملک ـــــــــ (انفرادی) ''۴۰۰ روپے

ـــــــــ (ادارے) ''۶۰۰ روپے

پاکستان ـــــــــ (انفرادی) ''۲۰۰ روپے

ـــــــــ (ادارے) ''۳۰۰ روپے

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے دعوت آفسٹ پرنٹرس دہلی ۔۶ سے چھپواکر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

مسلم غیر مسلم تعلقات — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق و تنقید

خطاطی۔ اسلام کی نظر میں — مولانا محمد ارتقاء الحسن کاندھلوی — ۱۹

عبدالمطلب ہاشمی اور خاندانِ رسالت کے بعض افراد کے اصل نام — پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۴۳

بحث و نظر

قرآنِ کریم میں پرندوں سے استشہاد — ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی — ۵۷

احسان وتصوف کے بعض اصولی مباحث — ڈاکٹر عبیداللہ فہد — ۷۱

ترجمہ و تلخیص

فتاویٰ اور استنباطِ مسائل میں شدت پسندی کا رجحان — ڈاکٹر مسفر بن علی محمد القحطانی، مترجم: مولانا احمد نادر القاسمی — ۹۱

تعارف و تبصرہ

فرہنگِ سیرت — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۵

روایت ودرایتِ حدیث۔ ایک مطالعہ — // // // — ۱۰۷

ثنائیاتِ امام مالک — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۰

اسلامیات — // // // — ۱۱۲

گلوبلائزیشن اور اسلام — مولانا جاوید احسن فلاحی — ۱۱۳

فارسی ادب کا مطالعہ — // // // — ۱۱۵

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی — ۱۱۷

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ مولانا محمد ارتقاء الحسن کاندھلوی

استاد مدرسہ اسلامیہ سلیمانیہ، کیرانہ روڈ، کاندھلہ، یوپی

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

ناظم دینیات (سنی)، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد

ریڈر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۵۔ ڈاکٹر مسفر بن علی محمد القحطانی

الاستاذ المساعد، قسم الدراسات العربیۃ والاسلامیۃ، جامعۃ الملک فہد، سعودیہ

۶۔ مولانا احمد نادر القاسمی

اسلامک فقہ اکیڈمی، جوگا بائی، نئی دہلی۔۲۵

۷۔ محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۸۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۹۔ مولانا جاوید احسن فلاحی

اے، ڈی، اے کالونی، شاہ جمال، علی گڑھ

۱۰۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حرفِ آغاز

مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات

——— سید جلال الدین عمری

اس وقت دنیا کے بیشتر ملکوں میں مخلوط اور ملی جلی آبادیاں ہیں۔ ان میں زیادہ تر مختلف نسلیں، مختلف تہذیبیں، مختلف مذاہب اور مختلف زبانیں پائی جاتی ہیں۔ ان ممالک کا ایک حصہ اکثریت پر مشتمل ہے تو دوسرا حصہ اقلیت میں ہے۔ دونوں کے اپنے مسائل ہیں اور وہ انہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ جمہوری ملکوں میں اقلیت اور اکثریت کے مساوی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بالعموم اقلیتیں اکثریت کا دباؤ محسوس کرتی ہیں اور ان کے حقوق کی پوری طرح نگہداشت نہیں ہو پاتی۔ ان کا ایک بڑا مسئلہ آپس کے تعلقات کا بھی ہے۔ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ایک سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ ان کے اکثریت کے ساتھ کس قسم کے روابط ہونے چاہئیں؟ کیا وہ ان سے الگ تھلگ اور کنارہ کش رہیں گے یا ان سے قریبی تعلقات رکھیں گے، یہ تعلقات کسی خاص دائرے میں محدود نوعیت کے ہوں گے یا ان کا دائرہ وسیع ہوگا، وہ انہیں حریف اور مخالف سمجھ کر معاملہ کریں گے یا ان کا رویہ ان کے ساتھ الفت ومحبت، ہمدردی اور حسن سلوک کا ہوگا؟ یہ آج کا ایک نازک مسئلہ ہے۔ اس پر چند خاص پہلوؤں سے غور کرنا ہوگا، اس سے اسلام کے موقف کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکے گا۔

۱- معاشرے میں ایک فرد کے دوسرے فرد پر اور ایک گروہ کے دوسرے گروہ پر جائز اور فطری حقوق ہوتے ہیں یہ حقوق آپس کے تعلقات کی نوعیت

متعین کرتے ہیں۔ان ہی سے تعلقات میں حسن وخوبی یا فساد اور خرابی پیدا ہوتی ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے حقوق تسلیم کئے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ حقوق ضائع ہورہے ہوں تو مسلم اقلیت کا کیا رویہ ہوگا؟ کیا وہ ان کی حمایت میں کھڑی ہوگی یا غیر جانب دار رہے گی؟

۲- اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے بہت ہی اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی ہے اور اپنے ماننے والوں کو اس کا پابند بنایا ہے۔کیا یہ اخلاق صرف مسلمانوں کے لیے ہیں یا غیر مسلموں سے تعلقات میں بھی وہ ان کے پابند ہوں گے اور ان کے ساتھ وہی اخلاقی رویہ اپنائیں گے جو رویہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اختیار کرتے ہیں؟

۳-مسلمان ایک ایسی امت ہیں جس کی زندگی کا بڑا مقصد دعوت الیٰ اللہ ہے، ایک غیر مسلم معاشرے میں اس کی دعوتی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے قرآن مجید نے کیا ہدایات دی ہیں اور مخاطب قوم سے کس طرح کے تعلقات کا حکم دیا ہے؟

مظلوم کے حقوق کی حمایت

سب سے پہلے انسانی حقوق کے مسئلہ کو لیجئے۔معاشرہ میں کسی فرد یا گروہ کے جو جائز اور فطری حقوق تسلیم کئے جائیں وہی دوسرے فرد اور گروہ کو حاصل ہوں اور وہ ادا کئے جائیں تو تعلقات خوش گوار ہوں گے ورنہ ان میں لازماً بگاڑ پایا جائے گا۔

انسان کا معاشرے کے بہت سے افراد سے دُور ونزدیک کا تعلق ہوتا ہے، اور اس پر ان سب کے کم یا زیادہ حقوق عائد ہوتے ہیں۔اسلام نے یہ سارے حقوق تسلیم ہی نہیں کیے ہیں، بلکہ انہیں ادا کرنے کی سخت تاکید کی ہے۔یہ حقوق جس طرح ایک مسلمان کے ہیں اسی طرح غیر مسلم کے بھی ہیں۔یہاں چند حوالے

دیے جارہے ہیں۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَاتُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (بنی اسرائیل : ۲۶)

قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو اور اپنی دولت بے جا مت خرچ کرو۔

ان حقوق میں سے بعض کی نوعیت قانونی ہے، لیکن یہ زیادہ تر اخلاقی ہیں، اسی لیے ان کے لیے قرآن مجید میں 'احسان' کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں حسن سلوک کرنا، خیر اور بھلائی کا رویہ اختیار کرنا اور اچھا معاملہ کرنا۔ ارشاد ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ (النساء : ۳۶)

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور احسان کرو ماں باپ کے ساتھ، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی اور صحبت میں رہنے والے کے ساتھ اور مسافروں اور غلاموں کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو اِتراتا اور فخر کرتا ہے

بنی اسرائیل سے جن امور کی پابندی کا عہد و پیمان لیا گیا تھا ان میں احسان کا یہ رویہ بھی شامل رہا ہے (البقرہ: ۸۳)

احسان یا حسن سلوک میں محبت، ہمدردی، نصیحت اور خیر خواہی کے ساتھ اقتصادی تعاون اور مالی مدد بھی شامل ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ''بِر'' یعنی حسن سلوک کی حقیقت بیان ہوئی ہے، اس کے ذیل میں ارشاد ہے:

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ .....(البقرۃ:۱۷۷)

اور مال کی محبت کے باوجود اسے خرچ کرے، قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں پر (ان کو آزاد کرنے کے لیے) اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔

سورۂ بقرہ ہی میں انفاق سے متعلق سوال کا جواب دیا گیا ہے ؎

وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْأَقْرَبِیْنَ وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ

وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں تو ان سے کہہ دیجئے جو کچھ بھی تم اپنا مال خرچ کرو وہ والدین اور قرابت داروں، یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے ہو اور جو بھلائی تم کروگے

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ○

اللہ تعالیٰ اسے اچھی طرح جانتا ہے

(البقرہ:۲۱۵)

ایک انسان پر معاشرے کے جن افراد اور طبقات کے حقوق عائد ہوتے ہیں ان کا ذکر قرآن مجید کی مکی سورتوں میں بھی ہے اور مدنی سورتوں میں بھی، مکے میں جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا سماج کے کم زور، مغلوب اور محکوم افراد ہی کے حقوق پامال نہیں ہو رہے تھے، بلکہ قریب ترین عزیزوں کے حقوق پر بھی اور خونی رشتہ داروں پر بھی دست درازی جاری تھی۔ اسلام نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ حقوق پامال ہو رہے تھے، انہیں دنیا اور آخرت میں اس کے بدترین نتائج سے آگاہ کیا۔ اس طرح اسلام ظلم کے خلاف اور مظلوموں کی حمایت میں کھڑا ہو گیا۔ اس وقت مسلمان کم تعداد میں، یا یوں کہیے کہ ناقابلِ لحاظ اقلیت میں تھے۔ وہ عملاً ان حقوق کی حفاظت کے موقف میں نہیں تھے، لیکن اسلام

ان حقوق کے علم بردار کی حیثیت سے سامنے آ رہا تھا اور یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ اگر اسے طاقت و اقتدار حاصل ہو تو وہ ان حقوق کی حفاظت کرے گا اور معاشرے کو ان کے احترام کا پابند بنائے گا۔ چنانچہ مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دیا گیا اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، چاہے وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، بے اختیار ہوں یا با اختیار، وہ ان انسانی حقوق کے محافظ ہوں گے اور کسی کو کسی کے حق پر دست درازی کی اجازت نہ دیں گے۔ جس کسی کی بھی حق تلفی ہو اس کے خلاف آواز بلند کریں گے اور اسے اس کا حق دلانے کی سعی کریں گے۔

اخلاقی رویہ

اب اس موضوع پر اخلاقی نقطۂ نظر سے غور کیجئے۔ ایک انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ کس قسم کے روابط ہوں اس کا تعلق اخلاق اور قانون دونوں سے ہے، لیکن اس معاملے میں قانون سے زیادہ اخلاق کی اہمیت ہے۔ اسلام نے جن اخلاقیات کی تعلیم دی ہے ان سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ مسلمان کا غیر مسلم کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہئے؟ اسلام اپنے ماننے والوں کو اخلاقی اقدار کا پابند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان والوں کو خدا ترس اور راست باز انسانوں کے ساتھ ہونا چاہئے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۝ (التوبۃ: ۱۱۹)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

ان کی زبان کھلے تو حق و انصاف کے لیے کھلے۔ انصاف کے

معاملے میں وہ اپنے اور غیر کا فرق نہ کریں۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الأنعام : ۱۵۳) — بولو تو انصاف کی بات بولو چاہے اس کی زد تمہارے کسی رشتہ دار ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

یہود اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے کبھی اس خیال سے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے کہ آپ کے فیصلے میں قانونِ توریت کے مقابلہ میں آسانی اور سہولت ہو تو قبول کرلیا جائے ورنہ رد کردیا جائے۔ حکم ہوا کہ جب کبھی آپ فیصلہ کریں عدل وانصاف کا دامن چھوٹنے نہ پائے:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (المائدة : ۴۲) — ان کے معاملات میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کی راہ اختیار کرنے کی سخت ہدایت کی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (المائدة : ۸) — اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے واسطے، انصاف کے گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

وہ کہتا ہے کہ آدمی بغیر علم وتحقیق کے زبان نہ کھولے نہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○ (بنی اسرائیل : ۳۶)

جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یاد رکھو کہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کے بارے میں سوال ہوگا۔

وہ اللہ کے نیک بندوں کے کردار کی تعریف کرتا ہے کہ وہ باعفت اور پاک باز ہوتے ہیں، ان کا دامنِ سیرت زنا اور بدکاری سے ملوث نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے صرف جائز اور حلال طریقے اختیار کرتے ہیں۔ جو لوگ اس کے لیے ناجائز راستے تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ حدود نا آشنا، بے راہ رو اور غلط کار ہیں۔ (المومنون: ۵ - ۷)

وہ بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ پھٹکنے اور ان سے دُور رہنے کی تاکید کرتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الأنعام : ۱۵۱)

اور بے حیائی کے کاموں سے، چاہے وہ کھلے ہوں یا چھپے ان کے قریب نہ جاؤ۔

اس کا حکم ہے کہ اہلِ ایمان جس کسی سے عہد و پیماں کریں اس کی پابندی کریں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدۃ: ۱)

اے ایمان والو! عہد و پیمان کو پورا کرو

وہ ان کی ایک خوبی یہ بیان کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدَاتِهِمْ قَائِمُوْنَ ○ (المعارج : ۳۲ - ۳۳)

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ دوسروں کا حق مارنا بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ تباہی کا راستہ ہے جو اس پر چلتا ہے اپنی تباہی کا سامان کرتا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o (المطففین: ۱-۳)	تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے، جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا وزن کر کے دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔

اللہ کے جو بندے اس حقیقت سے واقف ہوں ان سے کسی کے حق پر دست درازی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان کے معاملات صاف ستھرے اور ظلم سے پاک ہوں گے۔

سورۂ الفرقان کے آخر میں اہلِ ایمان کی خوبیوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں کہ وہ تکبر کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ عاجزی اور فروتنی کی روش اختیار کرتے ہیں۔ وہ جاہلوں کے منہ نہیں لگتے۔ جاہل ان سے الجھتے ہیں تو سلام کر کے گزر جاتے ہیں۔ (آیت ۶۳)

وہ بخل اور اسراف وتبذیر سے بچتے اور درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔ مال کو صحیح جگہ اور ضرورت کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ (آیت: ۶۷)

وہ انسانی جان کا احترام کرتے ہیں اور ناحق کسی کو قتل نہیں کرتے اور زنا اور بدکاری سے بچتے ہیں (آیت: ۶۸)

وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جھوٹے معاملات سے دُور رہتے ہیں، وہ لغویات سے شریفانہ طور سے گزر جاتے ہیں۔ (آیت: ۷۳)

سورۂ شوریٰ میں فرمایا کہ وہ کبائر اور فحش کاموں سے اجتناب کرتے ہیں اور کوئی انہیں غصہ اور طیش میں لائے تو اسے معاف کر دیتے ہیں۔ وہ کسی سے انتقام بھی لیتے ہیں تو حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ (۳۷-۴۰)

ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ معاشرے میں الحاد، بے دینی، خدا بے زاری فحاشی اور عریانی، بداخلاقی، جھوٹ اور مکر وفریب نہیں پھیلاتے، انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے (آل عمران: ۱۱۰) وہ نیکی، تقویٰ اور اخلاق کی فضا عام کرتے ہیں۔

یہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی ایک جھلک ہے۔ جس فرد یا گروہ کی اس اخلاقی فضا میں نشوونما ہو اور جو ان اخلاقیات کی تربیت پائے اس کے بارے میں بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دوسروں کے ساتھ کیا رویہ ہوگا اور وہ ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھے گا؟

ان اخلاقیات کا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے اور غیر مسلموں سے بھی۔ کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ صرف مسلمان ہی آپس میں ان کے پابند رہیں گے اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کا رویہ دوسرا ہوگا۔

بہت سی اخلاقی تعلیمات کے مخاطب مسلمان یا اسلامی معاشرہ ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، بلکہ وہ اسلام کی تعلیم اور اس کی روح کے لحاظ سے بالکل عام ہیں۔ ان کی پابندی مسلم اور غیر مسلم سب کے ساتھ ہوگی، اسے دو ایک مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده

(مشکوٰۃ: کتاب الایمان)

یعنی حقیقی معنوں میں مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامتی میں رہیں۔ یہاں "المسلمون" مذکر کا صیغہ ہے، لیکن اسی کے ذیل میں مسلمان عورتیں بھی آجاتی ہیں۔ یہی حکم ذمی کا بھی ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں المسلمون کی جگہ الناس کا لفظ آیا ہے جو ہر ایک کے لیے عام ہے (مرقاۃ المصابیح: ۱/۱۴۳)

ایک اور حدیث میں مومن کی تعریف ان الفاظ میں آئی ہے:
المومن من أمنه الناس علی دمائهم و أموالهم (مشکوٰۃ، کتاب الایمان، بحوالہ ترمذی ونسائی۔ اس کی تخریج کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح ۱۹۸/۱۱)

یعنی مومنِ حقیقی اور مومنِ کامل وہ ہے کہ لوگ اسے اپنی جان و مال کا امین سمجھیں اور اس کے سلسلے میں انہیں یہ اطمینان ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہر طرح مامون ومحفوظ ہیں اور انہیں اس سے کسی گزند کے پہنچنے کا خطرہ نہیں ہے۔ یہ رویہ مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی کے ساتھ ہوگا۔

ان حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ خود مسلم اور مومن کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

ایک حدیث میں نابینا کی تھوڑی سی رہنمائی کی فضیلت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ **من قاد أعمیٰ أربعین خطوة وجبت له الجنة**

اس میں اعمیٰ کا لفظ عام ہے۔ اس سے جس طرح ایک نابینا مسلم مراد ہے اسی طرح ذمی نابینا بھی مراد ہوسکتا ہے (مناوی: التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۴۳۳/۲)

دعوتِ دین کے تقاضے

اب آیئے دعوت کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔

مسلمان درحقیقت داعی الی اللہ ہے، یہ اس کی ایک اہم دینی ذمہ داری ہے۔ غیر مسلموں سے تعلقات پر غور کرتے وقت اس پہلو کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے ان بندوں سے داعی کا تعلق نصح وخیر خواہی کا ہو، جس تک اس کا دین پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کا اپنی مخاطب قوم کے ساتھ جس طرح کا تعلق ہوتا تھا وہ ہمارے لیے بہترین نمونہ

ہے۔ حضرت نوحؑ فرماتے ہیں ؎

اُبَلِّغُکُمْ رِسَالَاتِ رَبِّیْ وَ أَنْصَحُ لَکُمْ (الأعراف : ۶۲)	میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمہارے ساتھ خیر خواہی کر رہا ہوں۔

اسی خیر خواہی کا اظہار حضرت ہودؑ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلَاتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ''o(الأعراف:۶۸)	میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں اور میں خیر خواہ اور امین ہوں۔

یہی حال اللہ کے تمام پیغمبروں کا ہوتا ہے۔ نصیحت کے اندر اخلاص، محبت اور خیر خواہی کا تصور ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی دل سے ان لوگوں کی بھلائی کا طالب ہو جن کو وہ دین کی دعوت دے رہا ہے اور خلوص کے ساتھ ان کے سامنے دین اور اس کے تقاضے واضح کرے، توحید کا تصور پیش کرے، رسالت اور آخری رسول ﷺ کے حق میں دلائل فراہم کرے اور آخرت کی کامیابی اور ناکامی کو کھول کر بیان کرے۔ اللہ کے رسولوں کے اندر مخاطب قوم کی اصلاح کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ ان کی فکری و عملی اصلاح چاہتے ہیں، حضرت شعیبؑ کس قدر سوز اور دردمندی کے ساتھ فرماتے ہیں :

وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَا اَنْهٰکُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ (هود:۸۸)	اور میں نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تمہیں منع کرتا ہوں بعد میں وہ خود کرنے لگوں۔ میں تو جہاں تک مجھ سے ہو سکے، بس اصلاح چاہتا ہوں۔ توفیق تو مجھے اللہ ہی سے ملے گی اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

اس معاملے میں قلب کی وہ کیفیت ہونی چاہئے جو اللہ کے رسولوں

کی ہوا کرتی تھی۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی اس کیفیت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی آثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ أَسَفًا ○ (الکھف : ۶)

شاید آپ ان کے پیچھے اپنے نفس کو ہلاک کر ڈالیں گے افسوس اور غم میں، اگر وہ اس کلام (قرآن) کو نہ مانیں۔

حکم ہے کہ دعوت کا کام حکمت اور موعظۂ حسنہ اور جدالِ حسن کے ذریعہ انجام دیا جائے اور صبر کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ اشتعال سے بچا جائے اور اس راہ کی تکلیفوں کو برداشت کیا جائے اور عفو درگذر سے کام لیا جائے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت متعین ہونی چاہئے۔

عدمِ موالات کس سے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کفار و مشرکین سے عدمِ موالات کا اور ان کو دوست نہ بنانے کا حکم ہے اور انہیں راز دار بنانے سے منع کیا گیا ہے، تو پھر ان سے تعلقات قائم کرنے کی کیا بنیاد ہوگی۔؟

اس سلسلے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ان ہدایات کا تعلق جہاد سے ہے، حالتِ جنگ اور حالتِ امن کے احکام بڑی حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ جس قوم سے جنگ ہو اس سے عدمِ تعلق اور دور رہنے کا لازماً حکم دیا جائے گا اور خفیہ طور پر اس سے تعلق رکھنے پر سرزنش کی جائے گی۔ اس پر آدمی مستحقِ تعزیر بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جنگ کی جگہ صلح ہو اور دو قومیں کسی معاہدۂ امن کی پابند ہوں تو اس کا حکم مختلف ہوگا، جس قوم سے جنگ نہ ہو جس نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور دشمنی کا رویہ نہ اختیار کیا ہو اس کے بارے میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اس کے ساتھ بِر و قسط، اور حسن سلوک میں کوئی چیز مانع نہیں

ہے

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (الممتحنة: ۸)

اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس کے فوراً بعد یہ بھی بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن سے قلبی تعلق اور قریبی روابط کا رکھنا صحیح نہیں ہے:

اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَ ظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ (الممتحنة: ۹)

اللہ تعالیٰ تمہیں منع کرتا ہے کہ جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو اور جو کوئی ان سے دوستی کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے عدمِ موالات کا حکم ان لوگوں سے دیا ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کے اقدامات کئے اور ان کے دشمنوں کی مدد بھی کی لیکن جو قوم مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہو اور مسلمانوں سے عداوت اور دشمنی نہ رکھتی ہو اور جن سے مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچی ہو، اس کے ساتھ تعاون، ہمدردی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کی دعوت قبول کی جا سکتی ہے، تبلیغی مقاصد کے لیے ان کی دعوت کی جا سکتی ہے، ان کے تحفے قبول کئے جا سکتے

ہیں ان کے ساتھ سلام اور دعا کا جواز موجود ہے۔ رسول ﷺ نے غیر مسلم کی عیادت کی ہے، فقہاء نے ان کی تعزیت کو صحیح قرار دیا ہے، مخصوص حالات میں ان کی تدفین میں بھی شرکت ہوسکتی ہے۔ اس طرح کے مسائل میں اہلِ علم کے درمیان اختلافات بھی ہیں جن سے ان امور کی گنجائش بہر حال نکلتی ہے اور آدمی حالات کے لحاظ سے کسی پہلو کو اختیار کرے تو اسے غلط نہیں کہا جا سکتا (اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' مطبوعہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علیگڑھ)

عقائد پر استقامت

یہاں اس بنیادی حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اسلام عقیدۂ توحید پر قائم ہے، یہ عقیدہ، الحاد اور خدا بے زاری اور ہر طرح کے شائبۂ شرک سے پاک ہے۔ رسالت اور آخرت پر ایمان اسلامی عقیدے کا لازمی جزء ہے، اس لیے مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اسے اپنے عقیدے کی حفاظت کرنا اور اس پر قائم رہنا لازم ہے۔ وہ اس سے کسی حال میں دست بردار نہیں ہوسکتا، آج کے حالات میں غیر اسلامی افکار مسلمانوں پر ہر طرف سے اثر انداز ہو رہے ہیں، اس کے ساتھ جہاں کہیں وہ اقلیت میں ہیں ان پر اکثریت کا فکری، تہذیبی اور سیاسی دباؤ بھی مستقل رہتا ہے، اس میں دینِ اسلام پر استقامت بہت مشکل ہے لیکن انہیں استقامت کا ہر حال میں ثبوت دینا ہوگا، وہ چھوٹی سی چھوٹی اقلیت میں ہوں تو بھی انہیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ ان کا عقیدہ مجروح نہ ہو اور اسلام کے بنیادی تصورات پر حرف نہ آنے پائے، وہ اپنے فکر ونظر اور سیرت وکردار سے مومن ومسلم اور اسلام کے علم بردار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہیں۔ ❁❁❁

خطاطی۔ اسلام کی نظر میں

مولانا محمد ارتقاء الحسن کاندھلوی

خطاطی مسلمانوں کے لیے وہ خوب صورت، دل آویز اور دل نواز فن ہے، جو ہمیشہ سے ان کی توجہ کا مرکز اور ان کی محنت وشوق کا محور رہا ہے۔ یہ فن ان کے لیے دین و علم کی لذت کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی تھا اور ان کے ذوق جمالیات اور آرٹ کے اظہار کا وسیلہ بھی، اس لیے انہوں نے اس میں وہ تنوع، خوب صورتی اور رنگا رنگی پیدا کی کہ دنیائے جمال حیرت زدہ رہ گئی، مسلمان اہلِ فن کے حسنِ کتابت اور فنی کمال سے بھرپور ایسے ایسے یادگار نمونے موجود ہیں، جن پر ذوق وجد کرتا اور مصوری جن کی بلائیں لیتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ فن اس اعتبار سے مذہبی ضرورت بھی ہے کہ اس قوم کا وجود ہی علمی بنیادوں پر استوار ہے اور یہ اپنے پہلو میں قرآن مجید جیسا علمی معجزہ رکھتی۔ یہ بات کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ علمی ترقیات کتابت کے بغیر تقریباً ناممکن ہیں۔ اسلام اگرچہ زندگی کے مختلف شعبوں میں حسن و جمال کی ترغیب دیتا ہے، مگر اپنی جمالیاتی تہذیب کے دائرے میں انتہائی پاکیزگی ونفاست کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ خطاطی و کتابت کی قدر افزائی اس لیے بھی ہے کہ وہ انسانیت کی ترقی و بہبود کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت نفیس اور پاکیزہ فن ہے۔

خطاطی آنکھوں کے لیے ایسی ہی ہے جیسے کانوں کے لیے موسیقی۔ جس طرح ایک دل فریب نغمہ وجد کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، اسی طرح خوش نویسی کا عمدہ نمونہ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتا ہے۔ اس فنِ لطیف کے ساتھ انسان (جس کی فطرت

جمالیات کی دل دادہ ہے) کے شغف اور والہانہ انہماک کا سبب یہی ہے کہ وہ تشنگی علم کو بجھانے کے ساتھ ساتھ اس کے ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان بھی ہے ۔ بقول مولوی احترام الدین شاغل ''شعر اگر سامعہ نواز ہے تو خط باصرہ افروز'' ۔[۲]

خط کی ابتدا و ایجاد کے متعلق ایک خیال:

خط کی ابتداء و ایجاد اور اس کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ یہاں موضوع بحث نہیں ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ خط کا وجود دنیا کے وجود سے پیش تر ہے ۔ یہ ایک عجیب اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خدائے حکیم وخبیر نے انسان ہی نہیں، بلکہ تمام مخلوقات سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اس سے قضا وقدر کی کتابت کا کام لیا۔ ارشاد نبوی ہے:

أول ماخلق اللّٰه القلم [۳] سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

الأقلام فی الأصل ثلاثة: القلم الأول : الذی خلقه اللّٰه بیده وأمره أن یکتب . والقلم الثانی : أقلام الملائکة، جعلها اللّٰه بأیدیهم یکتبون بها المقادیر والکوائن والأعمال ، والقلم الثالث : أقلام الناس جعلها اللّٰه بأیدیهم یکتبون بها کلامهم ویصلون بها مآربهم . [۴]

بنیادی طور پر قلم تین ہیں: پہلا قلم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کر کے لکھنے کا حکم فرمایا، دوسرا قلم فرشتوں کا قلم ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں میں دے رکھا ہے ، ان سے وہ تقدیرات ، تکوینیات اور بندوں کے اعمال لکھتے ہیں ، تیسرا قلم، انسانوں کا قلم ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں میں دیا ہے کہ وہ اس سے اپنا کلام لکھیں اور اپنی ضروریات پوری کریں۔

یہ تیسرا قلم انسانوں کے ہاتھ میں کب اور کس طرح دیا گیا؟ اس کی تفصیلات و احوال تاریخ کے صفحات پر رقم کیے جاچکے ہیں اور جدید تحقیقات وانکشافات کا سلسلہ بھی جاری ہے ۔ تاہم ایک خیال یہ بھی ہے کہ خط ''توقیفی'' چیز ہے، یعنی انسانوں نے ضرورت کے پیش نظر اس کو ایجاد نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اہمیت کی بنا پر یک بارگی انہیں سکھلا دیا، بعد

میں انسانوں کے ذریعے اس کی ترقی ہوتی رہی۔ امام بدرالدین زرکشیؒ لکھتے ہیں:

والذی نقوله : ان الخط توقیفی لقوله :"عَلَّمَ بِالقَلَمِ، عَلَّمَ الإنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ "وقال تعالیٰ : "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ "(واذا کان کذا)فلیس ببعیدأن یوقف آدم وغیره من الأنبیاء علیهم السلام علی الکتاب . ۵

ہمارا کہنا یہ ہے کہ خط ایک "توقیفی چیز" ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان:"عَلَّمَ بِالقَلَمِ عَلَّمَ الاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ "اور "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَایَسْطُرُوْنَ " کی وجہ سے (اور اگر بات ایسی ہی ہے) تو یہ قرینِ قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام کو لکھنا سکھلا دیا ہو۔

آگے لکھتے ہیں:

إن أسماء هذه الحروف داخلة فی الأسماء التی علّم اللّٰه تعالیٰ آدم علیه السلام .۶

ان حروفِ تہجی کے نام بھی ان ناموں میں شامل ہیں ، جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھلائے۔

مزید لکھتے ہیں:

وما اشتهر أن أبا الأسود أول من وضع العربیة وأن الخلیل أول من وضع العروض فلا ننکره، وإنما نقول إن هذین العلمین کانا قدیماً، وأتت علیهما الأیام، وقلّا فی أیدی الناس، ثم جدّدهما هذان الإمامان .۷

رہی یہ بات جو مشہور ہے کہ ابوالاسود نے سب سے پہلے عربی قواعد اور خلیل بن احمد نحوی نے سب سے پہلے علم عروض وضع کیے، تو ہم اس کا انکار نہیں کرتے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں علم قدیم ہیں جو گردشِ زمانہ کی نذر ہوکر انسانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، ان دونوں اماموں نے ان کی تجدید کی۔

مذکورہ اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ زرکشی کتابت کی تاریخ کے منکر نہیں ہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ قرآنی آیات اور بعض قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کو تحریر و کتابت سکھلا دی تھی، لیکن چوں کہ اس وقت

تک تمدنی زندگی کا دائرہ محدود تھا، اس وجہ سے یہ فن ضائع ہوگیا، بعدازاں مختلف زمانوں اور علاقوں میں مختلف شخصیات کے ہاتھوں اس کی تجدید اور از سرنو شیرازہ بندی ہوئی، جس کے مفصل احوال تاریخ میں محفوظ ہیں۔

اگر اس بات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو خط و کتابت کے موجد اور واضع کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے اس کی ایجاد میں حصہ لیا اور ان کے زمانے میں، علاقے یا کام کی نوعیت کے اختلاف کی وجہ سے ہر ایک کو الگ الگ موجد قرار دے دیا گیا۔ اس طرح اس بارے میں پائی جانے والی متفرق اور کثیر الاختلاف تاریخی روایات کا تضاد بھی دور ہوجائے گا۔

انسانی زندگی میں خطاطی و کتابت کی اہمیت:

خطاطی اور کتابت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اشاعتِ علم، تہذیب و تمدن، اعلیٰ اخلاقی کردار کی تشکیل اور ذوقِ جمال کی تسکین میں دونوں کے الگ الگ کردار ہیں۔ بنیادی طور پر کتابت تحصیلِ علم کا ذریعہ ہے۔ اس میں عام طور سے تحسینِ قلم، پروازِ فکر اور تخلیقی آرائش پر توجہ نہیں دی جاتی، بلکہ زائد سے زائد لکھنے کی سعی کی جاتی ہے۔

انسانی زندگی میں خط و کتابت کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ خط کی ایجاد سے پہلے انسان کی ترقی کا سفر سست روی سے طے ہو رہا تھا، خط کی ایجاد سے اس میں تیزی آئی اور اس کی ترقی سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ اب اس کی رفتار کا یہ عالم ہے کہ پہلا قدم زمین پر ہے، دوسرا چاند پر ہے، اور تیسرا مریخ پر رکھا جاتا ہے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے:

''مہذب قوموں میں سب سے زیادہ مابہ الامتیاز یہ خط ہی ہے..... جو قوم فنِ تحریر سے ناآشنا ہے، اس میں اور حیوانوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق ہے۔''[۸]

خط انسان کی فطری ضرورت ہے۔ حیوانات اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر ہیں نہ ان کی فطری یکسانیت اس کا تقاضا کرتی ہے، جب کہ فطرتِ انسانی کی بوقلمونی کے لیے اظہار و بیان ضروری ہے، چناں چہ ابتدائے تخلیق میں ہی اللہ تعالیٰ نے اس میں زبان

وبیان کی صلاحیت پیدا فرمادی تھی، پھر چوں کہ تمدنی زندگی اور کاروبارِ جہاں کے نظم ونسق کے لیے ان بیانات اور تعبیرات کو محفوظ رکھنا ناگزیر تھا، اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بقول علامہ ابن خلدون ''ہوا کی مدد سے منھ کے اندر سے نکلتے ہیں اور ہوا کے ساتھ ہی غائب ہوجاتے ہیں''۹ اس لیے انسان کو ایسے نقوش سکھلائے گئے جو ان بیانات پر صحیح طور سے دلالت کرسکیں اور ان کو دیر تک قائم رکھ سکیں۔ گویا تحریر و کتابت بھی بیان ہی کی ایک صورت ہے، جو بنی نوع انسان کا امتیازی وصف ہے۔

بہرکیف! خط و کتابت کے انسانی زندگی کی تشکیل، تمدن و معاشرت کی وسعت وفروغ اور تہذیبِ اخلاق کے باب میں دوٗر رس اور دیر پا اثرات ہیں۔ علامہ ابن خلدون خطاطی کی حقیقت واہمیت کی بابت رقم طراز ہیں:

وهو رسوم وأشكال حرفية تدل على الكلمات المسموعة الدالة على مافي النفس، فهو ثاني رتبة من الدلالة اللغوية ،وهو صناعة شريفة ، إذ الكتابة من خواص الإنسان التي يميز بها عن الحيوان، وأيضاً فهي تطلع على مافي الضمائر وتتأدى بها الأغراض إلى البلد البعيد فتقضي الحاجات، وقددفعت المؤنة المباشرة لها، ويطلع بها على العلوم والمعارف وصحف الأولين و ما كتبوه من علومهم وأخبارهم . ۱۰

خط ایسے حرفی نقوش اور شکلوں کا نام ہے جو سنے ہوئے کلموں پر دلالت کرتے ہیں اور یہ کلمے مافی الضمیر کی طرف رہنما ہوتے ہیں، لہٰذا خط لغوی دلالت کی نسبت ثانوی درجہ رکھتا ہے، خطاطی و کتابت ایک باعزت فن ہے، اس لیے کہ یہ انسان کی ایسی خصوصیت ہے جس کے ذریعے وہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، نیز یہ دل کے اندر تک جھانک لیتا ہے اور اس کی وجہ سے دوٗر دراز کے شہروں سے بھی مقاصد پورے ہوجاتے ہیں، مزید یہ کہ علوم و معارف سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، اور گزشتہ لوگوں کے صحیفوں اور ان علوم اور حالات کی اطلاع ملتی ہے جو وہ لکھ کر گئے۔

قاضی محمد ثناء اللہ عثمانیؒ (م ۱۲۲۵ء) اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''تفسیر مظہری'' میں آیتِ کریمہ ''الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ الخ'' کے تحت لکھتے ہیں:

علّم الخط بالقلم ، ليفيد به العلوم و الكتب المنزلة فيبقى بعد مضى الدهور ويعلم به البعيد و إنما خصّ علم الخط أولا بالذكر إظهاراً لشرفه فإن الغرض من التعليم الحفظ ، وتبقية العلوم وحفظها غالباً بالكتابة عادةً. ۱۱

اللہ تعالیٰ نے قلم سے لکھنا سکھایا، تاکہ علوم و فنون اور آسمانی کتابوں کو اس سے فائدہ پہنچے کہ صدیاں بیت جانے کے باوجود وہ باقی رہیں، اور ہر دور کے لوگوں کو بھی ان کا علم ہوجائے، اور خط وتحریر کا پہلے اس لیے ذکر کیا تاکہ اس کی قدر ومنزلت کا اظہار ہو، کیوں کہ حصولِ علم کا مقصد اس کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے اور علم کی حفاظت و بقا عام طور سے کتابت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

إن قوله "بالقلم "متعلق بـ"علّم" معنىٰ علّم العلوم بتوسط القلم وإنما قدّمه في الذكر لكون التعليم بالقلم أسبق التعلّمات . ۱۲

اللہ تعالیٰ کے قول "بالقلم "کا تعلق "علم" سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام علوم قلم کے واسطے سے سکھلائے اور تعلیم بالقلم کو مقدم ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب سے اوّلین تعلیم ہے۔

علامہ قرطبیؒ اپنی مشہور تفسیر ''الجامع لأحكام القرآن ''میں لکھتے ہیں:

نبّه على فضل علم الكتابة ، لما فيه من المنافع العظيمة التي لايحيط بها الا هو ، وما دوّنت العلوم ولاقيدت الحكم ولا ضبطت أخبار الاولين و مقالاتهم ولا كتب

اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ ''الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ '' کے ذریعے فنِ کتابت کی فضیلت سے باخبر کیا ہے کہ اس میں ایسے عظیم فائدے ہیں جن کا کوئی دوسرا فن احاطہ نہیں کرسکتا۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو نہ حکمت کی باتیں قیدِ تحریر میں

اللّٰہ للمنزلة إلا بالكتابة ، ولو لا هي ما استقامت أمور الدين والدنيا [۱۳]

آتیں نہ گذشتہ لوگوں کی خبریں اور بات چیت محفوظ رہتی اور نہ آسمانی کتابیں ہی لکھی جاتیں۔اگر خط نہ ہوتا تو دینی ودنیوی امور ٹھیک ٹھیک انجام نہ پاتے۔

کتابت کا مقام وہی ہے جو ایک ظرف اور برتن کا ہوتا ہے۔عمدہ سے عمدہ غذا اگر گندے اور آلودہ ظرف میں پیش کی جائے تو نفیس طبیعت اس کو چکھنا بھی گوارا نہیں کرتی ، جب کہ معمولی غذا اگر نفیس ظرف میں ہوتو بے اختیار طبیعت اس کی طرف کھنچتی ہے۔فنِ خطاطی کا علم پر احسان ہے کہ اس نے علم کو ایسا عمدہ ظرف بخشا کہ دل خود اس کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔آج بھی جب دوسوتین سوسال پرانے کسی مخطوطے پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار کاتب کے حق میں کلمات آفریں نکلتے ہیں اور دل اس کے ذوق وفن کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔یہ بھی مشاہدہ ہے کہ نہایت نفیس اور اعلیٰ مواد اور مشتمل تحریر اگر سلیقے سے نہ لکھی گئی ہوتو اسے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔تاریخ میں اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ عمدہ کتابت نہ ہونے کی وجہ سے کتابیں ناقابلِ استفادہ قرار پائیں۔ابن خلدون ایک سلسلۂ کلام کے ذیل میں لکھتے ہیں:

فصارت الخطوط بافريقية والمغربين مائلة إلى الرداءة ، بعيدة عن الجودة، وصارت الكتب اذا انتسخت فلا فائدة تحصل لمتصفّحها منها إلا العناء والمشقة لكثرة مايقع فيها من الفساد والتصحيف وتغيير الأشكال الخطية عن الجودة، حتى لاتكاد تقرأ الا بعد عسر. [۱۴]

افریقہ اور مغرب کے خطوط بے کار، ردی اور عمدگی سے دور ہوگئے، چناں چہ جو کتابیں لکھی گئیں ان کی ورق گردانی کرنے والے کو تکلیف اور مشقت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا تھا، اس لیے کہ اس میں اس قدر فساد اور اغلاط ہوتی تھیں اور کتابت کی شکلیں اتنی بدل دی جاتی تھیں کہ مشقت کے بغیر ان کو پڑھا بھی نہ جاسکتا تھا۔

مزید یہ کہ خطاطی نے علم کو زمانی و مکانی وسعت عطا کی ہے۔ اس بات کا انکار نہیں کہ علم کا محل قلب و دماغ ہے، لیکن اس کی اشاعت و توسیع انسانی سینوں سے زیادہ کاغذ کے سفینوں سے ہوئی ہے۔ خط نہ ہوتا تو علم کا بیش تر حصہ ضائع ہو جاتا ہو اور جو باقی رہتا اس کے اعتبار و استناد پر شک کے بادل منڈلاتے رہتے، جیسا کہ ماقبل الخط کے علوم کے ساتھ ہوا۔

مرزا غالب خط کو آدھی ملاقات کہا کرتے تھے، کیوں کہ خط کی تحریر میں خیالات اور جذبات و احساسات کے ساتھ لکھنے والے کے ہاتھ کے نقوش بھی ہوتے ہیں۔ ان نقوش سے لکھنے والے کا تصور ابھرتا ہے، جو یادوں کی بارات ساتھ لاتا ہے اور واقعتاً آدھی ملاقات کا لطف آجاتا ہے، بلکہ بسا اوقات تحریر کے ذریعے ایسے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہو جاتی ہے جو زبان سے ادا نہ کیے جا سکیں۔ اس اعتبار سے خط زبان سے زیادہ بلیغ اور مؤثر ہے۔

خطاطی اور کتابت سے انسان کی عقل و شعور میں اضافہ ہوتا ہے:

شخصی سطح پر خطاطی اور کتابت کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی عقل و شعور میں پختگی اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں:

إن النفس الناطقة للإنسان إنما توجد فيه بالقوة وإن خروجها من القوة إلى الفعل إنما هو بتجدد العلوم والإدراكات عن المحسوسات أولا، ثم مايكتسب بعدها بالقوة النظرية إلىٰ أن يصير إدراكا بالفعل وعقلاً محضاً وتكون ذاتاً روحانية ويستكمل حينئذ وجودها۔[۱۵]

عقل انسان میں ابتدا ہی سے موجود ہوتی ہے، پہلے نئی نئی معلومات اور محسوس چیزوں کے ادراک کے ذریعے اس کا ظہور ہوتا ہے، پھر استدلالی قوت سے اس کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے، حتی کہ وہ عملی طور پر ادراک و عقل اور ایک روحانی شے بن جاتی ہے، تب اس کا وجود مکمل ہوتا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

والكتابة من بين الصنائع أكثر إفادة لذلك، لأنها تشتمل على العلوم والأنظار بخلاف الصنائع، وبيانه أن في الكتابة انتقالاً من الحروف الخطية إلىٰ الكلمات اللفظية في الخيال، ومن الكلمات اللفظية في الخيال إلىٰ المعاني التي في النفس، ذلك دائماً فيحصل لها ملكة الانتقال من الأدلة إلى الدلالات، وهو معنى النظر العقلي الذي يكسب العلوم المجهولة، فيكسب بذلك ملكه في التعقل، تكون زيادة عقل ويحصل به قوة فطنة وكيس في الأمور لما تعود وه من ذلك الانتقال، ولذلك قال كسرىٰ في كُتّابِه لما رآهم بتلك الفطنة والكيس فقال "ديوانه" اى مجنون.[16]

فنونِ لطیفہ میں یہ فائدہ سب سے زیادہ فنِ کتابت سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ دیگر فنون کے برخلاف علوم واستدلالات پر مشتمل ہوتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کتابت میں ذہن لکھے گئے حروف سے خیالی طور پر ابھرنے والے کلمات کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور خیالی کلمات سے ان معانی کی طرف جو دل میں ہیں، یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، حتی کہ کاتب کو دلائل سے مدلولات کی طرف منتقل ہونے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے اسی کو غور وفکر اور عقلی استدلال کہا جاتا ہے، جس کے ذریعے معلوم علوم تک رسائی ہوتی ہے، اس طرح اسے عقل کو استعمال کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے جس سے اس کی عقل وشعور میں اضافہ ہوتا ہے، اور قوتِ فہم اور کاموں میں تجربہ ومہارت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے کسریٰ نے جب اپنے کاتبوں کی عقل وفہم اور تجربہ و مہارت کو دیکھا تو کہا کہ "یہ تو دیوانے ہیں"۔

قلقشندی نے ابن عبدربہ (صاحب العقد الفرید) کے حوالے سے لکھا ہے کہ بہت سے لوگ جو پستی ولاچارگی اور خستہ حالی وفقر کی زندگی گزار رہے تھے، اس فنِ لطیف کے سہارے عقل وشعور کے مراحل طے کر کے بڑے بڑے عہدوں اور بلند مرتبوں تک پہنچ گئے۔ ابن عبدربہ نے ایسے لوگوں کی طویل فہرست ذکر کی ہے۔[17]

تحریر و کتابت سے انسان کی عمر، قوم اور قبیلے کی شناخت ہوتی ہے:

خطاطی کا ایک اور حیرت انگیز فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کے اندرون، عمر اور اس کے قوم و قبیلے کا اندازہ لگالیا جاتا ہے۔ یہ علم سترہویں صدی کے ایک مغربی ماہرِ نفسیات مسٹر باڈول نے ایجاد کیا۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری لکھتے ہیں:

''اس جدید علم کے ذریعے سے انسان کی سیرت، اخلاق، عادت، نیک چلنی، بدچلنی، صحت، سن و سال، قوم و قبیلے کا پتہ خط کو دیکھ کر چلا لیا جاتا ہے۔ اس علم کی تائیدی مثالوں میں دکھایا گیا ہے کہ ۱۷۹۵ء تک نپولین اعظم کے دستخط سے حوصلہ مندی اور اعتمادِ نفس کا اظہار ہوتا ہے، ۱۸۰۴ء میں وہ صرف نپولین لکھتا تھا اور اس کی طاقت کی ترقی پر دستخط مختصر ہونے لگے تھے، دورانِ جنگ کے تمام دستخطوں کے نیچے جو لکیر نپولین کھینچتا تھا وہ بہت موٹی ہوتی تھی، اس کے عام خط سے اس کی تلوّن طبعی کا ثبوت دیا گیا ہے، واٹرلو کی شکست کے بعد جب اس کا دل پژمردہ سا ہوگیا تو اس وقت کے بعد اس کی تمام تحریروں کو سابقہ تحریر اور دستخط سے ملا کر اس علم کی تائید میں سراغ رسی کی گئی تو معلوم ہوا کہ پھر تا آخرِ عمر اس کے خط سے روانی رخصت ہوگئی، نہ حرفوں میں وہ پیوستگی باقی رہی نہ وہ روانی۔ دستخط کی لکیر میں بھی وہ اوج پسند کشش باقی نہ رہی۔ ۱۸

اس علم کے اصول وضوابط اور طور وطریق سے قطع نظر اتنا تو ہر حساس اور باشعور شخص غور کرسکتا ہے کہ دل و دماغ کے مختلف حالات میں تحریر کے جدا جدا انداز ہوتے ہیں۔ خوشی و مسرت کے موقع پر لکھی گئی تحریر میں عجیب کشش، رونق اور تازگی ہوتی ہے، جب کہ غم کے وقت کی تحریر پژمردگی اور پریشان خیالی کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اسی طرح بیمار آدمی کی تحریر میں وہ زندگی نہیں ہوتی جو صحت مند کی تحریر میں ہوتی ہے۔

خطاطی:

خطاطی کتابت سے ایک قدم آگے کا فن ہے۔ خطاطی انسانی خیالات و

احساسات کو محفوظ کرنے ہی کا ذریعہ نہیں، بلکہ کاتب کے فکر و احساسات اور فنی کمال کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

''فنِ خطاطی میں صرف خوش نویسی ہی شامل نہیں ہے، اس میں کاتب کا شعور، اس کی حس اور اس کا ذوق و شغف بھی داخل ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں جہاں مجسمہ سازی اور مصوری کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا، خطاطی ہی فنی تخلیق کے اظہار کا ایک وسیلہ رہی ہے، ورنہ محض تحریر تو ترسیل کا ایک طریقہ ہے اور اس سے صرف انسانی خیالات، جذبات و احساسات کو قلم بند کرنے اور انہیں ایک دوسرے تک پہونچنے کا کام لیا جاتا ہے۔''[۱۹]

صرف کاتب ہی نہیں، ہر فن کار اپنے فن میں کامل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے احساس، ذوق اور تخیل کو فن کا جز بنا دے۔ ابن کلیم (خطاط ہفت قلم) نے کسی خطاط کا قول نقل کیا ہے:

''تخیل ایک خوب صورت پیکر ہے، اس کو عمل میں لانا (یعنی صورتِ متخیلہ کا اظہار کرنا) بہت دشوار ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہی فن ہے''۔[۲۰]

کتابت اگر علم و حکمت اور حال و ماضی کی تاریخ کی حفاظت اور دوسرے فوائد کی حامل ہے تو خطاطی قوموں کی تہذیب و تمدن، مزاج و طبیعت اور ذوق احساس کی آئینہ دار ہے اور تہذیبِ اخلاق اور اعلیٰ اقدار کی ترویج و اشاعت میں بھی اس کا مؤثر کردار ہے۔ ہر دور میں مساجد اور عمارتوں کی دیواروں پر قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، عربی و فارسی کے عمدہ اشعار، حکیمانہ اقوال اور لطیف فقرے نقش کرانے یا طغروں اور فریموں کی صورت میں لٹکانے کی روایت رہی ہے۔ آج بھی باذوق اور ذی علم حلقے میں یہ روایت زندہ اور تر و تازہ ہے۔ خطاطی کے یہ شہ پارے، جو عموماً ماہر خطاطوں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں، اخلاقی مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں اور مختصر ہونے کے باوجود ایسے لطیف اور مؤثر پیرائے میں ہوتے ہیں کہ دل میں اتر جاتے ہیں، پھر چوں کہ در و دیوار پر ہونے کی وجہ سے بار بار ان پر نظر پڑتی ہے اس لیے ان کے دیرپا نقوش دل و دماغ پر ثبت ہو جاتے ہیں، اور بعض مرتبہ خطاطی کا ایک شہ پارہ زندگی میں صالح انقلاب کا محرک بن جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے خطاطی اور کتابت:

عربوں کو من حیث القوم اپنی خداداد قوتِ حافظہ پر ناز تھا، اور غالباً یہی فخر و تکبر ان کے اور کتابت کے درمیان حائل تھا، نیز مزاج کا بدوی پن اور طبیعت کی وحشت ان کو فنونِ لطیفہ سے، جو تمدن کی پیداوار ہیں، دور رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں کتابت کا وجود برائے نام تھا اور جو کچھ تھا وہ قواعد و اصول سے عاری تھا۔ ابن خلدون رقم طراز ہیں:

فكان الخط العربي لأول الإسلام غير بالغ إلى النهاية من الإحكام و الإتقان والإجادة ولا إلى التوسط لمكان العربي من البداوة والتوحش وبعدهم عن الصنائع. ۲۱

عربوں کے بدوی پن، وحشت پسندی اور فنونِ لطیفہ کی دوری کی وجہ سے عربی خط ابتدائے اسلام میں پختگی، عمدگی اور مضبوطی کے کسی مقام پر نہیں تھا۔

جرجی زیدان لکھتے ہیں:

ليس في آثار العرب بالحجاز مايدلّ على أنهم كانوا يعرفون الكتابة إلا قبيل الإسلام، فجاء الإسلام و الكتابة معروفة في الحجاز و لكنها غير شائعة، فلم يكن يعرف الكتابة في مكة إلا بضعة عشر إنساناً ۲۲

اسلام سے کچھ پہلے عرب فنِ کتابت سے واقف ہو گئے تھے، لیکن حجاز میں موجود عربوں کے آثارِ قدیمہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ عرب اس سے پہلے بھی اس فن سے واقف تھے، چناں چہ اسلام کی آمد کے وقت حجاز میں یہ فن تھا تو، لیکن عام نہیں تھا، مکہ میں دس سے کچھ زائد افراد ہی کتابت جانتے تھے۔

اسی وجہ سے نزولِ قرآن کے بعد جب صحابہ نے قرآنِ پاک کو تحریر کا جامہ پہنایا تو ان کے رسم الخط میں رائج الوقت اصول و قواعد سے کہیں کہیں انحراف بھی پایا گیا، مگر صحابہ کا خط تھا اس لیے آنے والی نسلوں نے بطورِ تبرک اسی کو من و عن قرآن

پاک کے لیے اختیار کرلیا۔ بعض لوگوں نے رسم الخط سے ناواقفیت کو عیب خیال کر کے صحابہ کی برأت کی کوشش کی ہے۔ ابن خلدون ایسے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولاتلتفتنّ فی ذلک إلی مایزعم بعض المغفّلین من أنهم کانوا محکمین لصناعة الخط،وأن مایتخیّل من مخالفة خطوطهم لأصول الرسم لیس کما یتخیّل، بل لکلها وجه، ویقولون فی مثل زیادة الألف فی "لاأذبحنه" (النمل۔۲۱) أنه تنبیه علیٰ أن الذبح لم یقع،وفی زیادة الیاء فی "بأیید" (الذاریات۔۴۷) أنه تنبیه علیٰ کمال القدرة. ۲۳

اس سلسلے میں ان غفلت شعاروں کی بات پر توجہ نہ دیجیے، جو یہ کہتے ہیں کہ صحابۂ کرام فنِ خط سے پوری طرح واقف تھے اور ان کے خطوط میں جو رسم الخط کے اصول کی خلاف ورزی پائی جاتی ہے، وہ حقیقۃً خلاف ورزی نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کی وجہ ہے، چنانچہ وہ "لأذبحنہ" میں الف کی زیادتی کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے، کہ ذبح واقع نہیں ہوا تھا، اور "بأید" میں یا کی زیادتی کے بارے کہتے ہیں کہ اس سے قدرت کے کامل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غرض اسلام سے پہلے حجاز میں خطاطی و کتابت بحیثیت ایک فن کے نایاب اور معدوم تھی۔ مکہ جیسے شہر میں کل ۱۷/آدمی لکھنا جانتے تھے،۲۴ جب کہ حضرت عامرؓ کی حدیث میں ہے کہ "وکان أهل مکة یکتبون وأهل المدینة لا یکتبون "۲۵ یعنی مکہ والے لکھتے تھے اور مدینہ والے اس سے نابلد تھے۔ اس سے مدینہ کی صورتِ حال کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسلام میں خطاطی اور کتابت کی حیثیت:

اسلام میں خطاطی اور کتابت کی کیا حیثیت ہے؟ اس سوال کے جواب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ فلسفہ و سائنس سے ثابت ہو چکا ہے کہ محض خیر اور محض شر کا وجود

نہیں ہے، ہر چیز خیر وشر کا مجموعہ ہے، فرق اتنا ہے کہ کہیں خیر کا غلبہ ہوتا ہے اور کہیں شر کا۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ جس چیز میں شر کا غلبہ ہو اسے بالکلیہ ترک کر دیا جائے، خواہ اس کا خیر بھی ہاتھ سے جاتا رہے، اور جس چیز میں شر کا غلبہ ہے اسے لے لیا جائے، لیکن اس کے شر کے پہلوؤں پر روک لگادی جائے، مثال کے طور پر شراب کہ قرآن اس کے نفع کا ذکر کرتا ہے، پھر بھی اسے حرام قرار دیا گیا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ، وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (البقرۃ۔۲۱۹)	پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے، اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں۔

دوسری مثال کتابت وتحریر کی ہے۔ یہ ان چیزوں میں سے ہے جن میں خیر غالب ہے، لیکن اس سے شر کو راہ ملے یا اس کے غلط استعمال کا خطرہ ہو تو وہ ناپسندیدہ قرار پائے گا۔

غرض کتابت کو اگر ان صالح مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے جن کے لیے اس کو ایجاد کیا گیا ہے تو یہ نہایت عظیم اور فائدہ مند فن ہے۔ ایک ذریعۂ علم ہونے کی حیثیت سے قرآن نے اس فن کو بڑی اہمیت دی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس فنِ لطیف کی تمام تر ترقی کا سہرا قرآن پاک کے سر ہے۔ قرآن کی ابتداء ہی قلم کے ذکر سے ہوتی ہے، بعدازاں وہ بار بار مختلف پیرایوں اور مختلف اسالیب میں کتابت اور اس کے متعلقات کا تذکرہ کرتا ہے، کہیں کہتا ہے "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَايَسْطُرُوْنَ" (القلم:۱) اور کبھی کہتا ہے: "وَالطُّوْرِ وَ كِتَابٍ مَسْطُوْرٍ" (الطور:۲)۔ کہیں کہتا ہے: "وَلَو أَنَّمَا فِي الأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مانَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ" (لقمان:۲۷) اور کہیں: "وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَاباً فِيْ قِرْطَاسٍ" (الانعام:۷) فنِ کتابت کے لیے اس سے زیادہ فضیلت اور اہمیت کی بات کیا ہوگی کہ قرآن پاک میں لفظ "کتاب" کم وبیش ایک سو بائیس جگہ مذکور ہے۔[۳۶]

ایسی کتاب، جس کو ہر مسلمان پڑھتا ہے، بلکہ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کے برحق ہونے کا ایمان وعقیدہ رکھتا ہے، اس میں جب کسی فن کا اس قدر تذکرہ ہوگا تو فطری طور پر اس کی طرف توجہ مبذول ہونی چاہیے تھی اور ہوئی۔

اسلام میں کتابت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی قیادت کی اہم ترین ہستیاں اور بلند پایہ وعبقری شخصیات اپنے دورِ سیادت سے پہلے اس فنِ لطیف سے کسی نہ کسی درجے میں وابستہ رہی ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام عزیزِ مصر کے لیے، حضرت ہارون اور حضرت یوشع بن نون علیہما السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے، حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے، آصف بن برخیا اور یوسف بن عنقا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے، اور حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کتابت کیا کرتے تھے، دورِ خلافت پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ، خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ، خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت معاویہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابت کرتے تھے۔ حضرت مروان بن حکم حضرت عثمانؓ کے اور حضرت عبدالملک بن مروان حضرت معاویہؓ کے کاتب تھے۔ ان تمام حضرت کو اسلامی تاریخ میں غیر معمولی شہرت اور نام وری حاصل ہوئی۔ ۲۷

زبانِ نبوت سے کتابت کی اہمیت وفضیلت:

شمعِ حرم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچی تو نبی کریم ﷺ نے اس سلسلہ میں اقدامات کیے، غالباً سب سے اولین قدم غزوۂ بدر کے موقع پر اٹھایا گیا، جب مسلمانوں نے ستّر کفار کو قید کیا اور ہر ایک کی رہائی کے لیے ۴۰/ اوقیہ فدیہ مقرر کیا گیا۔ جس کے پاس زرِفدیہ نہیں ہوتا تھا، دس مسلم بچوں کو اس کے سپرد کردیا جاتا تھا، جن کو وہ لکھنا سکھاتا تھا۔ جب ان بچوں میں لکھنے کی مہارت پیدا ہوجاتی تھی تو یہی استاد کے لیے فدیہ تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں اچھی خاصی تعداد کتابت سے واقف ہوگئی۔ ۲۸

غزوۂ بدر کے اہم ترین قیدیوں کو محض دس بچوں کو لکھنا سکھانے کے عوض رہا

کر دینا محض اس بنا پر تھا کہ مسلمانوں میں کتابت کے تعلق سے احساس وشعور بیدار کیا جائے، کیوں کہ آگے چل کر اسلام کو مضبوط ترین بنیادوں پر استوار ہونا اور سارے جہاں کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دینا تھا اور یہ مقصد فنِ کتابت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

ہمیں احادیث کے ذخیرے میں ایسی روایات ملتی ہیں، جن سے اس فن کی قدر ومنزلت اور اس کے فوائد کا احساس ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قیّدوا العلم بالکتاب.۲۹ — علم کو رشتۂ تحریر سے منسلک کردو۔

ایک اور حدیث میں ہے:

إنّ من حق الولد علی والده أن یعلّمه الکتابة "۳۰ — باپ پر بیٹے کا حق ہے کہ وہ اسے لکھنا سکھائے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

الخط الحسن یزید الحق وضحاً ۳۱ — عمدہ خطاطی حق کی وضاحت میں اضافہ کردیتی ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ علم کا تحریر و کتابت سے ربط وتعلق صرف اتنا ہے کہ وہ اس کے لیے محافظ اور اس کی ترقی واشاعت میں معین ومددگار ہے، ورنہ حقیقی علم جو انسان کی آنکھوں کو کھولتا ہے اور راہِ حیات کی تیرگی میں اس کے لیے روشنی فراہم کرتا ہے، انسان کے سینوں میں ہوتا ہے، کاغذ کے سفینوں میں نہیں۔ چناں چہ اولیں ترجیح یہی ہے کہ علم کو دل میں محفوظ کیا جائے، مگر چوں کہ تمام تر کوشش کے باوجود ذہول ونسیان کا خطرہ لاحق رہتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسے لکھ بھی لیا جائے، تاکہ بوقتِ ضرورت مراجعت کی جاسکے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ وہ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں آپ کی حدیثیں روایت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، میری خواہش ہے کہ اس سلسلے میں اپنے دل کے ساتھ کتابت سے بھی مدد لوں، بشرطے کہ آپ اسے مناسب خیال کریں۔ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان کان حدیثی، ثم استعن بیدک مع قلبک ۳۲

اگر واقعۃً میری حدیث ہے تو دل کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے بھی مدد لو۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ لکھنے کے عادی تھے ان کا علم زیادہ وسیع اور محفوظ رہا۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

لم یکن أحد من أصحاب رسول اللہ ﷺ أکثر حدیثاً منی إلا عبد اللہ ابن عمرو بن العاص فإنہ کتب ولم أکتب ۳۳

حضور ﷺ کے صحابہ میں مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کے پاس نہیں ہیں، سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

زبانِ نبوت سے خطاطی کی اہمیت وفضیلت:

پہلے عرض کیا گیا تھا کہ خطاطی اور کتابت میں بنیادی فرق ہے کہ خطاطی میں حسن وآرائش پر زیادہ توجہ ہوتی ہے اور کتابت میں کثرتِ تحریر پر۔ زبانِ نبوت جہاں کتابت کی فضیلت بیان کرتی ہے وہیں خطاطی کی اہمیت سے بھی خاموش نہیں ہے، بلکہ کتابت کو حسین سے حسین تر بنانے والے کے لیے دنیوی واخروی زندگی میں ایسے وعدے کیے گئے ہیں جن کا بظاہر فن سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس سے نفس کو ترغیب ہوتی ہے ارشاد ہے: ☆

إذا کتبتم کتاباً فجوّدوا بسین "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تقضیٰ لکم الحوائج و فیہ رضی الرحمان عزّوجلّ. (۳۴)

جب تم کچھ لکھو تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی سین کو خوب سے خوب تر بناؤ، (اس کی برکت سے) تمہاری ضرورتیں پوری کی جائیں گی اور اس میں اللہ عزوجل کی رضا وخوشنودی بھی ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

☆ ذیل میں جو احادیث درج کی گئی ہیں ان کی صحت تحقیق طلب ہے (جلال الدین)

من كتب "بسم اللّٰه الرّحمن الرّحيم" فلم يعوّر الهاء التى فى "اللّٰه" كتب الله له عشر حسنات ومحا عنه عشر سيئات ورفع له عشر درجات ۳۵

جس نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا اور "اللہ" کی "ھاء" کو بدنما نہیں بنایا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دیتے ہیں، اس کے دس گناہ (نامۂ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں، اور اس کے دس درجے بلند فرما دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

اذا كتب أحدكم "بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحيم" فليمدّ "الرحمن". ۳۶ ☆☆

جب تم میں سے کوئی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھے تو "الرحمٰن" کو کھینچ کر لکھے۔

فنِ کتابت و خطاطی کی مجموعی اہمیت و فضیلت سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہمیں مشعلِ نبوت سے بعض اصول و آداب کی رہنمائی بھی ملتی ہے، ارشادِ نبوی ہے:

إذا كتب أحدكم فليترّبه ،فإن التراب مبارك وهو أنجع للحاجة. ۳۷ ☆☆

تم سے میں کوئی جب لکھے تو اس پر مٹی ڈال دے اس لیے کہ مٹی باعثِ برکت ہے، اور اس سے ضرورت زیادہ بہتر طریقے سے پوری ہوتی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

ضع القلم على أذنك،فإنه أذكر للمملئ. ۳۸

قلم اپنے کان پر رکھو کہ یہ (طریقہ) لکھنے والے کو زیادہ یاد دلانے والا ہے۔

یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ تصویر کشی، تصویر سازی و مجسمہ سازی کی ممانعت نے خطاطی کے فروغ اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ درحقیقت یہ بھی پیغمبر اسلام کی حکمت و دانائی کا نمونہ ہے کہ آپ نے مصوری سے متعلق انسانی صلاحیت کا رخ ایسے فن کی طرف موڑ دیا جو اپنی شکل و صورت اور طرزِ ادا میں مصوّری سے پوری طرح ہم آہنگ

☆☆ یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر طبع مصر ۱۳۸۶ھ/۱/۱۲۶ (جلال الدین)

ہونے کے ساتھ انسان کی ترقی و بہبود کا ذریعہ بھی ہے۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ انسانوں، جانوروں، ہتھیاروں اور دیگر اشیاء کی تصویروں میں عربی خطوط اور نستعلیق کے حروف کی شکلیں نہایت واضح ہے۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری نے ''تعلیم خط و املاء'' میں اس کی تفصیلات درج کی ہیں۔ وہیں سے کچھ باتیں مولوی احترام الدین شاغل نے بھی نقل کی ہیں۔ شاغل صاحب کی نستعلیق کے بارے میں ایک دل چسپ عبارت ملاحظہ ہو:

''مصوّر کا مونے قلم جو سحر آفرینی کرسکتا ہے، اس کا صحیح جواب اسی خط (نستعلیق) کے خوش نویس کا خامۂ اعجاز رقم ہوسکتا ہے۔ زلفِ یار کا پورا پرتو اسی کا ''ل'' ہوسکتا ہے، اور بعدِ مشکیں کے مقابلہ میں اسی کے میم کی گھنڈی آسکتی ہے، چشمِ سرمگیں کا حسن اسی کے سرصاد میں نظر آتا ہے۔ چہرۂ ماہِ رویاں کے جواب اسی کے آفتابی دائرے ہوسکتے ہیں، سروقامت کا جواب اسی کا الف ہوگا تو ابروئے خم دار کا بدل ''ط'' کی دورائے متصل، گوہرِ دنداں دندانہائے ''سین'' تو ''میم'' کا نزول ساق سمیں..... ''لا'' رشک سبابہ وسطی، مرکز تیر مژگاں کا بدل''۔[۳۹]

خطاطی اور کتابت کے بارے میں چند اقوال:

کسی بھی چیز سے متعلق اصحابِ علم و دانش کی آراء معتبر ہوتی ہیں۔ ذیل میں خطاطی و کتابت سے متعلق تاریخ کی عبقری شخصیات کے اقوال ذکر کیے جاتے ہیں، جن سے اس فن کی فضیلت و اہمیت اجاگر ہوگی:

(۱) حضرت قتادہؒ کا قول ہے:

القلم نعمة من الله عظيمةٌ، لولا القلم لم يقم دين ولم يصلح عيش.[۴۰]	قلم اللہ کی عظیم نعمت ہے، قلم نہ ہوتا تو دین قائم رہتا نہ زندگی صلاح پاتی۔

(۲) حضرت ابوقلابہؒ فرماتے ہیں:

الكتاب أحبّ الىّ من النسيان.[۴۱]	لکھ لینا میرے نزدیک بھول جانے سے بہتر ہے۔

(۳) حضرت سعید بن العاص نے فرمایا ہے:

من لم یکتب فیمینه یسریٰ ۴۳ — جو آدمی لکھ نہ سکے اس کا دایاں ہاتھ بھی بایاں ہے۔

(۴) معن بن زائدہ کا قول ہے:

إذالم تکتب الید فهی رِجلٌ ۴۳ — ہاتھ اگر نہ لکھے تو وہ پاؤں کی طرح ہے۔

(۵) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

لو لا کتابة العلم أی شیء کنانحن ؟۴۴ — اگر کتابتِ علم نہ ہوتی تو ہم کس شمار و قطار میں تھے۔

(۶) اسحاق بن منصورؒ (م ۲۵۱ھ) فرماتے ہیں:

لو لم یکتب العلم لذهب . ۴۵ — اگر علم کو لکھا نہ جاتا تو وہ ضائع ہو جاتا۔

(۷) طریح بن اسماعیل ثقفیؒ (م ۱۶۵ھ) فرماتے ہیں:

عقول الرجال تحت أسنان أقلامها ۴۶ — انسانوں کی عقلیں ان کے قلم کی نبوں کے نیچے ہیں۔

(۸) ابن ابی دوادؒ کہتے ہیں:

القلم سفیر العقل ورسوله ولسانه الأطول وترجمانه الأفضل .۴۷ — قلم عقل کا سفیر اور قاصد ہے، قلم عقل کی درازتر زبان اور افضل ترین ترجمان ہے۔

(۹) عبدالحمید الکاتب (م ۱۳۲ھ) کا قول ہے:

القلم شجرة ثمرها الألفاظ ، والفکر بحر لؤ لؤ ه الحکمة ، وفیه ریّ العقول الظمینة . ۴۸ — قلم ایک درخت ہے، الفاظ اس کے پھل ہیں، فکر ایک سمندر ہے، حکمت اس کا موتی ہے، اور اس میں پیاسی عقلوں کے لیے سیرابی ہے۔

(۱۰) عتابی (م ۲۲۰ھ-) کا قول ہے:

الأقلام مطایا الفطن ۴۹ — قلم فہم و دانش کی سواریاں ہیں۔

(۱۱)عتابی ہی کا ایک اور قول ہے:

بكاء الأ قلام تبتسم الكتب .۵۰ قلم کے رونے سے کتابیں مسکراتی ہیں۔

(۱۲)نظّام معتزلی (ابراہیم بن سیّار م ۲۳۱ھ) کا قول ہے:

الخط أصيل فى الروح وإن ظهر بحواس البدن. ۵۱ خطاطی کی جڑ روح میں پیوست ہے، اگرچہ یہ اعضائے جسمانی سے ظاہر ہوتی ہے۔

(۱۳)ارسطو (م ۳۲۲ق م) کا قول ہے:

القلم العلة الفاعلة، والمداد العلة الهيولانية، والخط العلة الصورية، والبلاغة العلة المتمّمة. ۵۲ قلم علتِ فاعلیہ، روشنائی علتِ مادیہ (ہیولانیہ) خطاطی علتِ صوریہ، اور بلاغت علتِ متممہ ہے۔

(۱۴)افلاطون (م ۴۲۸ق م) کا قول ہے:

الخط عقال العقل ۵۳ خطاطی عقل کی رسی ہے۔

(۱۵)اقلیدس کا قول ہے:

الخط هندسة روحانية وإن ظهرت بآلة جسمانية ۵۴ خطاطی ایک روحانی فن ہے، اگر چہ جسمانی آلے سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۱۶)ابودلف کہتے ہیں:

الخط رياض العلوم. ۵۵ خطاطی علوم کا باغیچہ ہے۔

(۱۷)بزرجمہر کا قول ہے:

الكتب أصداف الحكم تنشقّ عن جواهر الشيم. ۵۶ کتابیں حکمتوں کی سیپیاں ہیں، جن سے اخلاق وعادات کے موتی برآمد ہوتے ہیں۔

خطاطی کو اسلامی فن کہا جاتا ہے، اور بجا طور پر کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اس فن کے ساتھ جس قدر فریفتگی اور والہانہ پن کا مظاہرہ کیا ہے، کوئی دوسری قوم اس کی مثال نہیں پیش کرسکتی۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری نے لکھا ہے:

''مسلمانوں کا فخر اس پر بجا ہے کہ جب سے دنیا میں اسلام کا ظہور ہوا، مشرق میں مادرِ خطوط ''خط کوفی'' سے اس وقت تک جتنے خطوط ایجاد ہوئے، بلا کسی استثناء کے سب کے موجد مسلمان ہیں، اور مسلمان ہی کامل بھی گزرے، اگرچہ یہ خطوط دنیا کے مختلف ملک اور قوم میں پھیلے اور سبھی نے ان کو حاصل کیا، یہ مخصوص بات شاید خطاطی کے سوا کسی اور علم وفن کے ساتھ وابستہ نہ ہو'' ۵۷

یہ کوئی ثنا خوانی نہیں، بلکہ ایک واقعہ ہے۔ خوش نویسوں کے تذکرے اس کی شہادت دیتے ہیں جن میں ایسے بہت سے خطاطوں کے تذکرے شامل ہیں جنہوں نے اس فن کے ساتھ جنون کی حد تک دل چسپی کا مظاہرہ کیا اور اس کی نوک پلک سنوارنے اور نئی نئی چیزوں کی یافت وتلاش میں اپنی بیش قیمت صلاحیتوں کا نذرانہ پیش کیا۔

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

حواشی ومراجع

۱۔ قرآنی آیت ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ، قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوا (الاعراف:۳۲)

۲۔ صحیفۂ خوش نویساں/مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۳ھ، ص:۲۵۲

۳۔ سنن أبو داؤد، دار إحياء التراث العربي، بیروت، لبنان، ج:۴، ص:۲۲۶

۴۔ الجامع لاحکام القرآن، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، دار الفکر بیروت، لبنان، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء، ج:۱۰، ص:۱۰۸

۵۔ البرهان في علوم القرآن، امام بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی، دار إحياء الكتب العربية، طبعه اولیٰ ۱۳۷۶ھ/-۱۹۵۷ء، ج:۱، ص:۳۷۷-۳۷۸

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً
۸۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، اردو لغت بورڈ، ترقی اردو بورڈ، کراچی دسمبر ۱۹۸۷ء، ج:۸،ص:۵۹۵، بحوالہ "رسالہ تہذیب الاخلاق" ۱۸۹۴ء
۹۔ منشی نول کشور اور ان کے خطاط و خوش نویس، امیر حسن نورانی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص: ۳۷، بحوالہ ترجمہ اردو مقدمہ ابن خلدون
۱۰۔ مقدمہ، ابن خلدون، مطبعہ از ہریہ مصر، ۱۳۱۱ھ، ص: ۲۴۸
۱۱۔ التفسیر المظهری، قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی پانی پتی، ندوۃ المصنفین دہلی، طبعۂ ثانیہ، ۱۳۸۴ھ، ج:۱۰،ص:۳۰۴
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ الجامع لأحکام القرآن، ج:۱۰،ص:۱۰۷
۱۴۔ مقدمہ ابن خلدون، ص:۲۵۰
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ ایضاً
۱۷۔ صبح الأعشی فی صناعۃ الانشاء، احمد بن علی القلقشندی، دار الفکر بیروت ۱۹۸۷ء، ۱/ ۶۷
۱۸۔ خط و خطاطی، شیخ ممتاز حسین جونپوری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۶۱ء، ص:۵۹-۶۰
۱۹۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۷ء، ج:۳،ص:۲۳۵،
۲۰۔ نقوش رعنا موسوم مرقع خطاطی، ابن کلیم، دبستان فروغ خطاطی، ملتان ۱۹۷۸ء
۲۱۔ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۲۴۸
۲۲۔ تاریخ آداب اللغة العربیه، جرجی زیدان، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، لبنان، طبعۂ ثانیہ ۱۹۷۸ء، ج:۱،ص:۱۹۶،
۲۳۔ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۲۴۹
۲۴۔ اردو رسم الخط، پروفیسر سید محمد سلیم، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء بحوالہ فتوح البلدان، بلاذری، ص: ۴۵۷

۲۵ طبقات کبریٰ، ابن سعد، دار صادر، بیروت، لبنان، ج:۲، ص:۲۲
۲۶ ملاحظہ کیجیے۔ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، محمد فؤاد عبدالباقی، لفظ "الکتاب"
۲۷ طبقات ابن سعد، ۲/۲۲
۲۸ صبح الأعشی، ۱/ ۶۸
۲۹ سنن دارمی، مطبوعہ دار القلم، ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء، ج:۱، ص:۱۳۵
۳۰ کنز العمال، علامہ علاؤ الدین علی المتقی (م ۹۷۵ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۹ھ، ج:۱۶، ص:۴۵۷،
۳۱ کنز العمال، ج:۱۰، ص:۲۴۴
۳۲ سنن دارمی، ج:۱، ص:۱۳۶
۳۳ جامع بیان العلم وفضلہ، ابوعمر یوسف بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) دار ابن الجوزی، دمام، سعودی عرب، ۱۴۱۸ھ، ج:۱، ص:۲۹۹
۳۴ کنز العمال، ج:۱۰، ص:۲۴۶
۳۵ ایضاً
۳۶ ایضاً، ص:۲۴۴
۳۷ ایضاً، ص:۲۴۵
۳۸ ایضاً، ص:۲۴۴
۳۹ صحیفۂ خوش نویساں، ص:۴۰-۴۱
۴۰ الدر المنثور فی التفسیر المأثور، امام عبدالرحمان جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ) دار الفکر بیروت، لبنان ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ج:۸، ص:۵۶۴
۴۱ جامع بیان العلم وفضلہ، ج:۱، ص:۳۲۴
۴۲ صبح الأعشی، ۱/ ۶۵ ۴۳ ایضاً
۴۴ جامع بیان العلم وفضلہ، ج:۱، ص:۳۲۹ ۴۵ ایضاً
۴۶ تا ۵۶ الفہرست، ابن ندیم، دار الباز، مکۃ المکرمہ ۱۳۹۸ھ/ ۱۳۷۸ء ص:۱۵-۱۶
۵۷ خط وخطاطی، ص:۴۱

عبدالمطلب ہاشمی اور خاندانِ رسالت کے بعض افراد کے اصل نام

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سیرت و سوانح اور تذکرہ و تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے اکابر و شخصیات کے اصل ناموں پر شہرت و روایت سے پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ کسی دوسرے نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ مشہورِ عام نام کبھی لقب ہوتا ہے اور کبھی عرفیت۔ عرب و اسلامی تاریخ میں کنیت بھی نام کی جگہ لیتی رہی ہے۔ بعض صفاتِ عالیہ اور کبھی کبھی اوصافِ خبیثہ بھی اصل ناموں کو پس منظر میں ڈھکیلنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ ایسا بالعموم ممدوحوں کو فرشتہ اور مبغوضوں کو شیطان بنانے کی غیر معتدل مساعی کا سبب ہوتا ہے۔

خرابی اصلاً وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں تحقیق و جستجو کے بجائے کورانہ تقلید کی جاتی ہے۔ کسی ایک راوی خوش بیان اور سوانح نگارِ افسانہ طراز نے خوش نما روایت کو بیانیہ کا جزو بنا دیا۔ اب دوسرے معاصرین و متاخرین نے اس کو حقیقتِ واقعہ سمجھ لیا اور اپنی روایت میں مزید گل بوٹے ٹانک دئے۔ سلسلۂ روایت چلا تو نسل در نسل اور عہد بہ عہد اسی روایتِ واحدہ اور خبرِ واحدہ کو جمہور کا اتفاق بنا دیا۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ واقعی وہ مسلکِ جمہور ہے یا محض نقل در نقل اور اندھی تقلید کا سلسلہ، جسے مسلکِ جمہور کہا جاتا ہے۔

اب اگر کوئی صاحبِ علم وتحقیق قلندرانہ جسارت کر کے اصل نام یا سچے واقعہ کا کھوج لگاتا ہے تو اسے شاذ، ضعیف، کم زور روایت اور مسلکِ جمہور کے خلاف قرار دے کر رد یا نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جناب عبدالمطلب ہاشمی کے اصل نام نامی کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ ان کا خوب صورت وعظیم نام عوامی جمہوریت کے رنگ وروپ میں دب گیا۔ شخصیت پرستی اور روایت نوازی کے مارے ہوئے اہلِ سیر نے ان کی صفت کو نام کا درجہ دے دیا۔ تسمیہ وتوجیہ کی علمی کاوش نے ایک اور روایت سازی کر ڈالی۔ موجودہ مطالعہ اس عظیم شخصیت کے اصل نام کی تحقیق کی ایک کوشش ہے۔

مشہور نام کی توجیہ

ان کا مشہور ومعروف نام عبدالمطلب ہے جو ہمارے مصادر کے مطابق ایک پس منظر رکھتا ہے۔ ان کے والدِ ماجد جناب ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب نضری قریش اور مکّہ کے ایک عظیم شخص تھے۔ دوسرے اکابر واصاغرِ مکہ کی مانند تجارت کے لئے وہ مختلف منڈیوں کے علاوہ شام جایا کرتے تھے۔ اصلاً شامی تجارت ہی ان کی معاشی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی اور ان کی مال داری وخوش حالی کی بنیاد تھی۔ مکہ اور دوسرے جنوبی علاقوں کے تاجروں کا راستہ یثرب/مدینہ سے گزرتا تھا جو ایک منزل بھی تھی اور منڈی بھی۔ شام کے لئے آتے جاتے تاجرانِ مکہ وجنوبی عرب کی مانند جناب ہاشم بن عبدمناف مدینہ منورہ میں اپنے والدِ ماجد عبدمناف بن قصی کے ایک دوست عمرو بن زید نجّاری خزرجی کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ ان کے بھی دوست بن گئے تھے۔ ایک سفر کے دوران جناب ہاشم بن عبدمناف قریشی کو اپنے یثربی دوست و میزبان کی بیٹی سلمٰی بنت عمرو خزرجی پسند آگئی تو اس کا ہاتھ مانگ لیا، شادی کر لی اور اس کو اپنے وطن مکہ مکرمہ لے آئے۔

روایت کا دوسرا جزئیہ یہ ہے کہ شادی کے وقت دلہن کے والد اور خاندان والوں نے یہ شرط عائد کر دی کہ سلمٰی بنت عمرو نجّاری کے بطن سے ہاشم کی اولاد صرف

اپنی ننہیال - یثرب - میں پیدا ہوگی۔ کیوں کہ وہ ان کے خاندان کی روایت اور گھرانے کی ریت تھی۔ عمرو بن زید نجاری خزرجی کا خاندان اتنا اعلیٰ اور ان کی دختر نیک اختر سلمیٰ کی شان اتنی بلند پایہ تھی کہ ان کی اولادیں صرف ننہیال ہی میں جنم لے سکتی تھیں۔ ہاشم بن عبد مناف نے شرط کی پاسداری کی۔ متوقع ولادت کے پیشِ نظر وہ اپنی یثربی بیوی سلمیٰ کو یثرب پہونچانے کے بعد خود شام برائے تجارت چلے گئے۔ قضا و قدر کا فیصلہ کہ شام ہی میں غزہ کے مقام پر ان کا انتقال ہوگیا اور ادھر یثرب میں سلمیٰ نجاریہ خزرجیہ کے بطن سے ان کا ایک فرزند پیدا ہوا۔ ہاشم کی اچانک وفات کے سبب ان کی یثربی زوجہ اور فرزند کا واپس مکہ جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا، اور فرزندِ ہاشمی ننہیال میں پرورش پاتا رہا [1]

عرب روایتِ وصیت کے مطابق ہاشم بن عبد مناف نے اپنے بڑے بھائی مطلب بن عبد مناف کو اپنا وصی، جانشین اور گھربار و کاروبار کا متولی اور بیوی بچوں کا اتالیق و نگراں مقرر کر دیا تھا۔ مطلب بن عبد مناف نے اپنے مرحوم بھائی کی وصیت کے مطابق تمام ذمہ داریاں اٹھالیں، کیونکہ ہاشم کے تمام بچے چھوٹے تھے۔ ان کی وفات کم عمری میں ہوگئی تھی۔ روایت کے مطابق انتقال کے وقت وہ صرف پچیس سال کے تھے۔ یہی متفقہ روایت ہے۔ جناب مطلب نے ہاشم کی پہلی بیوی ہند بنت عمرو خزرجی یثربی سے شادی کر لی اور ان کے بطن سے پیدا تمام اولادِ ہاشم کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ مگر جناب ہاشم کے نومود فرزند یثرب میں ہی رہے، تا آنکہ وہ سات آٹھ برس کے ہو گئے۔ ان کے حسن و جمال، جودت و کمال اور اٹھان و پرورش کا چرچا عام ہوگیا۔

عام اور مشہور روایت یہ کہتی ہے کہ یثرب سے گزرتے ہوئے ایک حارثی (بنو حارث بن عبد مناۃ کے ایک گمنام فرد) نے یثرب کے کچھ لڑکوں کو تیر اندازی کرتے دیکھا تو ٹھہر گیا۔ ان میں سے ایک بچہ ٹھیک نشانہ لگاتا تو فخریہ کہتا کہ ''میں فرزندِ ہاشم ہوں، میں سردارِ مکہ کا لاڈلا ہوں (انا ابن هاشم، انا ابن سيد

البطحاء) حارثی نے بچے کے کمال و جمال سے متاثر ہو کر اس کا نام و نسب پوچھا اور مکہ مکرمہ آ کر مطلب بن عبد مناف کو بتا دیا۔ دوسری کم معروف یا گم نام روایت کے مطابق یثرب کے مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت خزرجیؓ کے والد ماجد ثابت بن منذر خزرجی کسی کام سے مکہ آئے تو مطلب بن عبد مناف کے گھر اترے کہ دونوں قدیمی دوست تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مطلب بن عبد مناف کو ان کے یتیم و ہونہار بھتیجے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

بہر کیف مطلب بن عبد مناف کو چہیتے بھائی کے ہونہار فرزند کی محبت اور اپنی ذمہ داری کے احساس نے شدت سے آمادہ کیا کہ وہ فرزندِ ہاشم کو یثرب سے لانے چل پڑے۔ ننہالی عزیزوں، بالخصوص بچہ کی ماں سلمٰی بنت عمرو نجاری نے پہلے تو اپنے فرزند کو حوالہ کرنے سے صاف انکار کر دیا، مگر مطلب بن عبد مناف کی محبت و وارفتگی نے ان کو اتنا مجبور کر دیا کہ وہ فرزندِ ہاشم کو اس کے شفیق و کریم چچا کے حوالے کر دیں، اور اجازت دے دیں کہ وہ اس کو اس کے باپ کے گھر لے جائیں اور وہاں اس کی پرورش و تربیت کریں کہ وہ سیدِ بطحاء کا فرزند ہے۔

جناب مطلب بن عبد مناف، فرزندِ ہاشم کو اپنے اونٹ کے پیچھے بٹھائے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔ کچھ گرد و غبار اور تکان کے سبب اور کچھ فرزندِ ہاشم کے معمولی اور بوسیدہ کپڑوں کے سبب مکہ کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ مطلب ایک نیا اور نوخیز غلام خرید لائے ہیں اور انھوں نے بچے کو ''عبد المطلب'' سمجھ لیا، اور نووارد فرزندِ ہاشمی کا یہی نام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا۔ ان کا نام ہی ''عبد المطلب'' پڑ گیا [۲]

روایات میں اس تسمیہ کی بعض جزئیات میں سخت اضطراب و اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک قسم کی روایت میں ہے کہ مطلب نے پہلے فرزندِ ہاشم کو اپنا خرید کردہ غلام ہی بتایا۔ بعض روایات کے مطابق اکابرِ قریش کے استفسار پر کہا تھا کہ ہاں میں نے اسے خریدا ہے۔[۳] ابن ہشام کی روایات میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ قریش نے جب فرزندِ ہاشم کو عبد المطلب کہا تو مطلب نے فوراً تردید کی اور ان کو بتایا کہ وہ

تو میرا بھتیجا اور فرزندِ ہاشم ہے۔ اکابرِ قریش نے باپ سے مشابہت کی بنا پر اسے تسلیم کرلیا۔ بلاذری وغیرہ کی روایات میں بھی یہ تصریح پائی جاتی ہے کہ مطلب بن عبدمناف نے بعد میں فرزندِ ہاشم کو نہلا دھلا کر اور عمدہ لباس پہنا کر اکابرِ قریش کے رؤ برؤ پیش کیا اور ان کو بتایا کہ وہ فرزندِ ہاشم اور ان کا بھتیجا ہے، لیکن عبدالمطلب کا نام ان پر کسی تہمت کی مانند چسپاں ہوگیا اور ان کا اصل نام پس منظر میں چلا گیا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے امام زہریؒ کی روایت نقل کی ہے جس کے مطابق مطلب ابن عبدمناف نے لوگوں کے استفسار پر بتایا تھا کہ وہ بچہ ان کا غلام ہے اور اسی بنا پر لوگ اس کو عبدالمطلب کہنے لگے۔[۴]

نامِ جمہور:

تقریباً تمام مصادر کا اتفاق ہے کہ جناب عبدالمطلب ہاشمی کا اصل نام شیبہ تھا۔ اس کی بھی ایک وجہِ تسمیہ ہے اور ایک پس منظر۔ سلمٰی بنت عمرو نجاری خزرجی سے جب ہاشم بن عبدمناف کا فرزندِ سعید پیدا ہوا تو اس کے سر میں کچھ سفیدی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے پیشانی کے گرد سفید دھاریاں تھیں، اس لیے اس کا نام نامی شیبہ یا شیبۃ الحمد رکھا گیا۔ بعض روایات میں صرف شیبہ نام ہے اور بعض میں شیبۃ الحمد اور بعض میں دونوں۔[۵]

ان روایات کی بنا پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فیصلہ کردیا کہ عبدالمطلب کا اصل نام جمہور کے نزدیک ''شیبۃ الحمد'' ہے۔[۶]

قریب قریب بعد کے تمام سیرت نگاروں نے یہ تسلیم کرلیا کہ فرزندِ ہاشم کا اصلی نام شیبہ یا شیبۃ الحمد تھا۔[۷]

ان تمام روایات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ بچے کے بالوں (پیشانی کے بالوں) کی سفیدی کے سبب شیبہ کہا گیا تھا۔ یہ اصل نام نہیں تھا۔ ایک جسمانی صفت کی بنا پر ماں نے اپنے چہیتے بچے کو اس عرفیت سے پکارا تھا۔ ''شیبۃ الحمد'' ان

کی خوبیوں، بالخصوص فیاضی وسخاوت کی بنا پر لقب پڑا تھا اور ظاہر ہے کہ اس لقب و عرفیت کا رواج ان کے بڑے ہونے پر ہوا تھا، جب وہ جود وسخاوت کے دریا بہانے کے لائق بنے تھے، بچپن یا پیدائش کے بعد شیبۃ الحمد کہلانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مطلب کو ہاشم کی وصیت کی روایت صریحاً غلط ہے کہ وہ وفاتِ ہاشم کا مقام مکہ بتاتی ہے، جب کہ تمام مستند روایات کا اتفاق ہے کہ ان کا انتقال غزہ میں ہوا تھا۔ مختلف ناقدینِ روایات نے اسی بنا پر اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ (بحث کے لیے حلبی وغیرہ ملاحظہ ہوں)

کتبِ انساب وتاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیبہ عربوں میں ایک عام نام تھا۔ عبدالمطلب کے کئی پیش رَو، معاصرین اور متاخرین اس نام سے موسوم ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ سب کی پیشانی کے بال بوقتِ پیدائش سفیدی نہیں رکھتے تھے۔ شیبہ بن ربیعۃ عبشمی، شیبہ بن عثمان عبدری، شیبہ بن مالک عامری کا ذکر صرف بلاذری میں موجود ہے۔[۸] ابن ہشام نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔[۹] ان کے علاوہ متعدد دوسروں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ بغدادی نے مذکورہ پانچ کے علاوہ شیبہ بن عمارہ، شیبہ بن نصاح المعلم کا اضافہ کیا ہے۔[۱۰] اسی مؤلف نے تعمیرِ کعبہ اور نبوی تنصیبِ حجرِ اسود کے ضمن میں ایک بابِ ''آل شیبہ'' کا ذکر کیا ہے، جو قدیم تر شیبہ تھے۔[۱۱]

اصل نام:

بہت کم ایسے قدیم وجدید سیرت نگار ہیں جنھوں نے جناب عبدالمطلب ہاشمی کے اصل نام کے صراحت کی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا اصل نام 'عامر تھا، یعنی عامر بن ہاشم۔ یہی نام ان کی والدہ ماجدہ یا نانا نے رکھا تھا۔ قدیم سیرت نگاروں یا اہلِ علم میں امام ابنِ قتیبہ دینوری نے غالباً سب سے پہلے اس کی صراحت بلاشک وشبہ کی ہے۔[۱۲] حلبی نے مجروح وضعیف روایت کے بطور نقل کیا

ہے کہ ان کا نام ''عامر'' بھی بتایا گیا ہے۔ ۱۳؎ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ابنِ قتیبہ کی روایت نقل کی ہے اور اس پر تنقید بھی کی ہے۔ ۱۴؎

جدید سیرت نگاروں میں قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے پوری وضاحت کے ساتھ ان کے نام و لقب پر لکھا ہے: ''ان کا نام عامر اور لقب شیبہ ہے۔ شیبہ کا ترجمہ زال یا بوڑھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ لقب صرف تفاؤل کے لیے تھا کہ عمر دراز پائے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ جب پیدا ہوئے تو اس وقت ان کی چندیا میں چند بال سفید موجود تھے۔'' ۱۵؎

ولیم مونٹگمری واٹ (W.Montgomery Watt) اور ان کے مقالہ کے مدیر گرامی نے لکھا ہے کہ ''عبد المطلب بن ہاشم [حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے دادا، قریشِ مکہ کے نام ور سردار، ان کا نام عامر، کنیت ابوالحارث اور لقب شیبہ ہے، انھیں فیاض اور مُطعِم (کھانا کھلانے والے) کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے] ۱۶؎ اصل مقالہ پر یہ اضافہ مدیر گرامی (ادارہ) کا معلوم ہوتا ہے کہ واضح طور سے مستقیم قوسین کے اندر دیا گیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ مقالہ کے جن اصل مصادر کا حوالہ آخر میں دیا گیا ہے ان میں سے کسی میں بھی اصل نام ''عامر'' کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری سے لیا گیا ہو کہ ثانوی مآخذ میں اس کا واضح ذکر ہے، بعض یوروپی مآخذ میں بھی ہوسکتا ہے۔

اجدادِ عبدالمطلب کے اصل نام:

صرف جناب عبدالمطلب ہاشمی کے اصل نام نامی پر شہرت و روایت پرستی کا پردہ نہیں پڑا، ان کی کئی قریبی پیڑھیوں کے اجدادِ کرام کے اسماء گرامی پر ان کی صفاتِ عالیہ کا ملمّع چڑھا دیا گیا ہے۔ نہیں معلوم یہ راویانِ خوش بیان کی کارستانی ہے، یا قصہ گویانِ عرب کی افسانہ تراشی و اسطورہ نگاری۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جناب عبدالمطلب کے والدِ ماجد، جدِّ امجد اور بانی خاندانِ عبد مناف کے اصل نام

دوسرے ہیں اور وہ مشہور و معروف دوسرے ناموں سے ہیں۔

سیرت و سوانح کے تقریباً تمام مصادرِ اصلی و ثانوی کا اجماعِ عام ہے کہ جناب عبد المطلب کے والدِ ماجد ہاشم بن عبد مناف بن قصی کا نام نامی ''عمرو'' تھا، مگر وہ اپنی فیاضی و سخاوت اور دورانِ قحط و خشک سالی اہلِ مکہ کو شہد و مکھن میں روٹی چورا کر کے کھلانے کے سبب ''ہاشم'' کے نام سے معروف ہو گئے کہ اس مادہ ''ھشم یھشم ھشمًا، ھشامًا'' کے معنی یہی ہیں اور ان کا اصل نام صفتِ عالیہ کے پردے میں ایسا مستور ہوا کہ اب صرف اہلِ تحقیق و صاحبانِ نظر ہی اس سے زیادہ واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۷

جناب ہاشم بن عبد مناف کے والدِ گرامی عبد مناف بن قصی کا اصلی نام ''مغیرہ'' تھا اور عبد مناف لقب یا عرفیت۔ روایات کے مطابق ان کے والدِ ماجد نے اپنے ایک بیٹے کا نام بیت اللہ کی نسبت سے عبد الدار کر دیا تھا، دوسرے کو اپنے عظیم ترین صنم ''مناف'' کی طرف منسوب کر کے عبد مناف بنایا، تیسرے کو والد مرحوم کے نامِ نامی کی طرف نسبت دی اور عبد قصی کہا۔ اور چوتھے فرزند کو بھی ایک دیوتا کے نام سے عبد العزیٰ پکارا تھا۔ ۱۸

قصی بن کلاب جناب عبد مناف کے والدِ ماجد، خاندانِ بنو عبد مناف کے بانی اول اور معمارِ شہرِ مکہ تھے۔ ان کا اصل نام قصی نہ تھا۔ وہ قصی کے نام سے اس لیے معروف و مشہور ہوئے کہ ان کی والدہ ماجدہ فاطمہ بنت سعد ازدی کا نسبی تعلق بنو کلب سے تھا اور ان کے والد کا قضاعہ سے۔ ان کے قریشی شوہر کلاب کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک قضاعی شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی اور وہیں جا بسیں۔ جناب قصی چھوٹے سے بچے تھے، لہٰذا وہ ماں کے ساتھ گئے اور اپنے اخوال (ننہالی رشتہ داروں) اور سوتیلے باپ کے گھر میں پلے بڑھے۔ اس لیے ان کا نام قصی یعنی ''دور رفتہ'' پڑ گیا، حالاں کہ ان کا اصل نام مشہور روایات کے مطابق زید بن کلاب تھا۔ ۱۹

امام علی بن برہان الدین الحلبی الشافعیؒ نے ایک اہم روایت اور ایک قطعی فتویٰ اس ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کے امامِ اعظم شافعیؒ فرماتے تھے کہ قصی کا اصل نام ''یزید'' تھا اور وہ ''مجمّع'' (جمع کرنے والے) بھی کہلاتے تھے۔ یہ وہ روایت ہے جس کا حوالہ کسی بھی اہلِ قلم اور سیرت نگار نے، غالباً حضرت یزید بن معاویہؓ کے نام سے مشابہت کی بنا پر، دینے کی جرأت نہیں کی۔[۲۰]

''یزید قصی کا نام تھا بقولِ امام شافعی'' اس روایت کو نقل نہ کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ تعجب مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ پر ہوتا ہے، کیوں کہ انہوں نے زرقانی کے حوالے سے قصی کا اصل نام زید لکھا ہے اور اس کو امام احمد بن حنبلؒ کی روایت سے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے۔ جب کہ حلبی نے امام شافعی کی سند پر لکھا ہے کہ ان کا نام یزید تھا۔ اب یا تو زرقانی اور ان سے نقل کرنے میں کاندھلوی سے تسامح ہوا ہے یا حلبی سے۔ حلبی کے ہاں تسامح کا سوال نہیں اٹھتا، کیوں کہ انہوں نے مشہور نام زید کے بالمقابل ہی یزید نام کی روایت امام شافعی سے کی ہے۔ ان کی روایت کی تائید ایک اور ماخذ سے ہوتی ہے جس میں قصی کا نام یزید بتایا گیا ہے اور ان کے باپ کلاب کی کنیت ابو یزید۔ ابن سعد نے اگرچہ ہاشم کی کنیت ابو یزید لکھی ہے، لیکن غالباً کاتب سے تسامح ہوا۔[۲۱] کیوں کہ ہاشم کے کسی فرزند کا نام یزید دستیاب معلومات کے مطابق نہیں تھا۔ غالباً وہ ابن یزید ہوگا کہ قصی کا نام یزید تھا۔ اسی طرح کاندھلوی نے عبد مناف کا اصل نام مغیرہ امام شافعی کی سند پر لکھا ہے اور وہ زرقانی اور سہیلی سے ماخوذ ہے۔ لیکن انہوں نے قصی کا نام یزید ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ امام شافعی کی سند کو قابلِ روایت ہی سمجھا۔

تاریخ اسماء و تذکرۂ نسب کے حوالے سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے اجدادِ کرام کے اصل نام کم از کم چار پیڑھیوں تک ان کی صفات یا عرفیت کے پردے میں چھپ گئے تھے۔ اور وہ جن ناموں سے مشہور ہوئے وہ ان کے اصل نام نہ تھے۔ لہٰذا ''عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی'' کا نسب

گرامی اصل ناموں کے ساتھ اس طرح ہوگا: ''عامر بن عمرو بن مغیرہ بن یزید یا زید''

رسولِ اکرم ﷺ کے والدِ ماجد جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کا نام نامی اصلی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر جناب عبداللہ کی قربانی کا واقعہ تسلیم کیا جائے تو ایک روایت کے مطابق جناب عبدالمطلب ہاشمی نے ان کا یہ نام (عبداللہ) قربانی والے دن رکھا تھا۔ اور ان کا اصل نام عبدالدار تھا، عبداللہ بطور شکرانہ نام رکھا تھا۔۲۲ اگر یہ روایت صحیح ہے تو نسبِ گرامی میں صرف رسول اکرم ﷺ کا اصل نام باقی ہے اور دوسرے تمام اسماء غیر اصل ہیں۔ تب نسب گرامی ہوگا: ''محمد ﷺ بن عبدالدار بن عامر بن عمرو بن مغیرہ بن یزید/زید''۔ عبداللہ نام رکھنے کی روایت عربوں میں موجود تھی، اگرچہ کم کم۔ وہ بھی ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔

اجدادِ نبوی کے اصل ناموں کی اس مفصل بحث کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے شفیق و کریم دادا جناب عبدالمطلب ہاشمی کا اصل نام ''عامر'' ان کے خاندانی اسماء کے عین مطابق تھا۔ عامر، عمر، عمرو، عمیر اور اس طرح کے دوسرے نام عرب کتبِ نسب اور مصادرِ تاریخ و سیرت میں متداول ناموں کی فہرست میں آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ اور قریش کے علاوہ دوسرے دیار و امصار بالخصوص یثرب/مدینہ میں بھی وہ مقبول ناموں میں شامل تھے۔ اس لیے بہت سے افراد کا نام عامر ملتا ہے۔ اور دونوں ادوار- جاہلی اور اسلامی ادوار- میں ملتا ہے۔ ابن ہشام، بلاذری، بغدادی وغیرہ کی کتبِ سیرت و سوانح اور صحابہ کرام کے تراجم میں بالخصوص بہت سے اشخاص و اکابر کا تذکرہ ''عامر'' نام سے پایا جاتا ہے۔

ایک دوسرا زاویہ یہ بھی ہے کہ جناب عبدالمطلب ہاشمی کے نانا کا اصل نام ''عمرو'' تھا اور ان کے والدِ ماجد ہاشم کا نام بھی عمرو تھا۔ ناموں کی مشابہت اور ایک مادہ کے مشتقات کی بنیاد پر نام رکھنے کا رواج عرب میں بھی تھا۔ اس لیے یہ عامل یقیناً نومولود فرزندِ ہاشم کے تسمیہ میں کارفرما رہا ہوگا، کہ والد اور نانا دونوں کے ناموں سے مشابہ اور اس کے مادہ سے مشتق نام رکھا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت

نہیں کہ عمرو اور عامر دونوں کا مادہ ''ع م ر (عمر)'' ہے۔ معنی کے لحاظ سے بھی یہ نام کافی اچھا ہے کہ آباد کار، عمرِ دراز پانے والے، زندہ کے معانی رکھتا ہے۔[۲۳]

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کی یہ بحث یا تنقید، کہ شیبہ جمہور کے نزدیک اصل نام ہے، صحیح نہیں ہے۔ یہ دراصل جمہور کے اجماع پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ایک شخص یا ایک راوی کا کارنامۂ تسمیہ ہے، جو بغیر تحقیق کے تمام لکھنے والوں کے ہاں نقل ہوتا رہا۔ ابنِ اسحاق کے راوی یا راویوں نے شیبہ ان کا اصل نام بتایا اور پھر تمام معاصرین و متاخرین نے اسی کو نقل کرنے پر اکتفا کیا، کسی نے تحقیق نہ کی۔ دوسری روایات سے بہرحال یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیبہ ان کو اس لیے کہا گیا تھا کہ ان کے سر میں چند سفید بال تھے۔ یہ نام نہیں، عرفیت یا لقب یا موقعہ کی مناسبت سے نام دھرنے کے مترادف ہے اور اس کے نمونے اردو میں رمضانی، بقرعیدی، عیدی، کلو وغیرہ جیسے ناموں میں ملتے ہیں۔

غالباً مصلحتِ الٰہی یہ تھی کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اصل اسمِ گرامی کے سوا آپ کے خاندانِ سامی میں دو'رد دو'رتک کسی جدِ گرامی کا اصل نام شہرت نہ پائے۔ ایک یہ بھی حقیقتِ محمدی ہے اور رفعِ ذکرِ محمدی کی ایک صورت۔

حواشی و مراجع

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ رسیرۃ النبیؐ، مرتبہ محمد محی الدین عبدالحمید، دارالفکر قاہرہ ۱۹۳۷ء، ۱/ ۱۴۸، سہیلی، الروض الانف، مرتبہ عبدالرحمٰن الوکیل، قاہرہ ۱۹۶۷ء، ۲/ ۶۶ و مابعد، ۸۷، ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت ۱۹۶۰ء، ۱/ ۷۸۔۷۹، طبری، تاریخ الرسل والملوک، مرتبہ محمد ابوالفضل ابراہیم، دار المعارف مصر ۱۹۶۱ء ۲/ ۲۴۶۔۲۴۷، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، دار صادر بیروت ۱۹۶۵ء، ۲/ ۱۰، بلاذری، انساب الاشراف، مرتبہ محمد حمید اللہ، دارالمعارف مصر ۱۹۵۹ء، ۱/ ۶۴، ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، مطبعۃ السعادۃ مصر

۱۹۳۲ء، ۲/۲۵۳، حلبی، السیرۃ الحلبیۃ، بیروت غیر مورخہ، ۱/۶۔۷، نیز محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء، ۲۹۷، کتاب المنمق، حیدرآباد دکن ۱۹۶۴ء، ۳۸۔۳۹ و مابعد۔

۲ ابن ہشام، ۱/۱۴۸، سہیلی ۲/۶۶ و مابعد، ابن سعد، ۱/۸۳

۳ طبری، ۲/۲۴۸، بلاذری، ۱/۶۵

۴ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۳۲ء، ۲/۲۵۳،

۵ ابن ہشام ۱/ ۱۴۸، سہیلی ۲/ ۶۶، ابن سعد ۱/ ۷۹، بلاذری ۱/۶۴، طبری ۲/۲۴۶، ۲۴۸، ابن کثیر، ۲/۲۵۳، حلبی ۱/۴، ۶

۶ ابن حجر، فتح الباری، مکتبہ دارالسلام، ریاض ۱۹۹۷ء، ۷/۲۰۵

۷ شبلی، سیرۃ النبی، اعظم گڈھ ۱۹۸۳ء، ۱/۱۶۶، محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دارالکتاب دیوبند غیر مورخہ، ۱/۳۲، سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالم، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۹ء ۲/۸۵-۸۶۔ صفی الرحمٰن مبارک پوری، الرحیق المختوم (اردو) المجلس العلمی گڈھ ۱۹۸۸ء، ۷۵، بحوالہ ابن ہشام ۱/ ۱۳۷، محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین ۱/۲۶، ۲/۲۴

۸ بلاذری ۱۲۴-۱۲۵، و مابعد، ۵۳-۵۴، و مابعد، ۳۳۵

۹ ابن ہشام، ۱/۲۷۶، ۳۱۵، و مابعد، ۳/۸۲، ۴/۳، ۷۳، ۱۴۲

۱۰ بغدادی، کتاب المحبر ۱۷، ۱۶۰، ۴۰۱، ۴۷۴، ۴۷۸ وغیرہ

۱۱ بغدادی، کتاب المنمق ۳۳۲

۱۲ ابن قتیبہ، کتاب المعارف، مرتبہ ثروت عکاشہ، قاہرہ، ۱۹۶۰ء، ۱۱۷

۱۳ حلبی، ۱/۴

۱۴ ابن حجر: ۷/۲۰۵

۱۵ منصور پوری، رحمۃ للعالمین، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۰ء، ۲/۷۰، نیز بحث بر شیبہ، شیبۃ الحمد، فیاض وغیرہ اسماء

۱۶ مقالہ ''عبدالمطلب بن ہاشم''، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۲/ ۹۵۷ و مابعد

۱۷ ابن ہشام ۱/ ۱۴۷، سہیلی ۲/ ۹۵، و مابعد، نیز تفصیلات مآثرِ ہاشمی وتسمیہ کے لیے، ابن سعد ۱/ ۷۵-۷۶، طبری، تاریخ ۲/ ۲۵۱-۲۵۲، بلاذری ۱/ ۵۸ و مابعد، ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۲/ ۲۵۳ و مابعد، ابن اثیر، الکامل ۱/ ۱۶ و مابعد، حلبی ۱/ ۵ و مابعد، شبلی ۱/ ۱۶۵-۱۶۶، منصور پوری ۲/ ۶۸، نیز ۲/ ۶۹-۷۰، مودودی، سیرت سرورِ عالم ۲/ ۸۲-۸۳، کاندھلوی ۱/ ۲۹-۳۰، مبارک پوری، ۷۴-۷۵

۱۸ ابن ہشام ۱/ ۱۱۸، سہیلی ۲/ ۲۸-۲۹ و مابعد، ابن سعد ۱/ ۷۰، طبری، ۲/ ۲۵۴، بلاذری ۱/ ۵۲-۵۳ و مابعد، ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۲/ ۲۵۴، ابن اثیر، الکامل، ۲/ ۱۸، حلبی ۱/ ۷، شبلی ۱/ ۱۶۵، منصور پوری، ۲/ ۶۳ و مابعد، کاندھلوی ۱/ ۲۹، بحوالہ زرقانی ۱/ ۷۳، روض الانف ۱/ ۶، مودودی، سیرت ۲/ ۸۱-۸۲، مبارکپوری، ۴۵-۴۶، و مابعد

۱۹ ابن ہشام ۱/ ۱۱۷، ۱۲۹، ۱۳۵، سہیلی ۲/ ۲۸-۲۹ و مابعد، ابن سعد ۱/ ۶۶-۶۷ و مابعد۔ طبری ۲/ ۲۵۴۔ بلاذری ۱/ ۴۸-۴۹ و مابعد، ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۲/ ۲۵۴۔ ابن اثیر، الکامل ۱/ ۱۸-۱۹، حلبی ۱/ ۷۔

۲۰ شبلی ۱/ ۱۶۳-۱۶۴، منصور پوری ۲/ ۶۱ و مابعد، کاندھلوی ۱/ ۲۶، بحوالہ زرقانی ۱/ ۷۳، مودودی، سیرت ۲/ ۷۹-۸۱، مبارکپوری، ۴۲-۴۶ و مابعد۔

۲۱ ابن سعد ۱/ ۸۰

۲۲ یعقوبی، تاریخ الیعقوبی، دار صادر بیروت ۱۹۶۰ء، ۲/ ۹

۲۳ لسان العرب، مادہ ''عمر''

☆☆☆

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت (پہلے ایڈیشن)
۱	معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۲۱۶	۲۵
۲	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۳۳۲	۱۰۰
۳	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۳۸۸	۱۷۵
۴	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۲۴۰	۸۰
۵	اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۱۷۶	۴۰
۶	اسلام اور مشکلاتِ حیات	مولانا سیّد جلال الدین عمری	۸۸	۸
۷	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۸	مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۲۰
۹	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۱۰	آزادیٔ فکر و نظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۱۱	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۱۲	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۴۰
۱۳	ایمان و عمل کا قرآنی تصور	پروفیسر الطاف احمد اعظمی	۲۸۰	۲۵
۱۴	عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا	ڈاکٹر روفہ اقبال	۲۴۷	۲۵
۱۵	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۶	شیئر بازار میں سرمایہ کاری- اسلامی نقطۂ نظر	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵
۱۷	تصوف- ایک تجزیاتی مطالعہ	پروفیسر عبیداللہ فراہی	۲۰۰	۲۵

ملنے کے پتے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵

بحث ونظر

قرآن کریم میں پرندوں سے استشہاد

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

اللہ تعالیٰ نے بے شمار جان داروں کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تخلیق کے کرشمے ان گنت ہیں۔ اس نے صرف ایک دنیا کے خالق کے طور پر اپنا تعارف نہیں کرایا ہے، بلکہ خود کو بہت سی دنیاؤں کا خالق کہا ہے۔ اَلحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ۔ (الفاتحہ -۱)

اللہ تعالیٰ کی بے شمار تخلیقات میں پرندوں کی تخلیق بھی ہے۔ پرندوں کی انواع و اقسام اتنی زیادہ اور متنوع ہیں کہ وہ اپنے آپ میں خود ایک دنیا ہے۔ انسانوں سے قریب بھی اور انسانوں سے ملتی جلتی بھی۔ اب تک پرندوں کی آٹھ ہزار چھ سو نسلیں دریافت کی جا چکی ہیں۔ اگر اس میں علاقائی نسلوں اور ذیلی اقسام کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد تیس ہزار تک پہنچتی ہے اور نہ معلوم کتنی نسلیں ابھی احاطۂ دریافت سے باہر ہیں [۱]

پرندے اپنی ساخت، مزاج، جسمانی حرارت، خوراک، عادات، دلچسپیوں، مصروفیتوں، ضرورتوں اور اپنے ماحول و مسکن کے لحاظ سے ہمیشہ سے انسان کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اگر پیدائشی اور حیاتیاتی بناوٹ میں وہ انسانوں سے مختلف ہیں تو ضرورتوں، عادتوں اور خواہشوں میں انسان کے مماثل بھی ہیں۔ پرندوں میں نظم وضبط اور اجتماعیت بھی انسانوں سے ملتی جلتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو اپنی تخلیق کا نمونہ بنا کر انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے اور ان کے مطالعہ، مشاہدہ، استفادہ اور سبق آموزی کی دعوت دی ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الاَرْضِ وَلاطٰئِرٍ — زمین میں چلنے والا کوئی جانور اور ہوا میں

يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام:۳۸) — اپنے پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح امت نہ ہو۔

پرندوں کی حیات، خصوصیات، عادات واطوار اور افزائشِ نسل پر تحقیق کرنے والوں نے بڑی عجیب اور دلچسپ باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ اس انکشاف سے قرآن کی مذکورہ آیت کے نت نئے زاویے روشن ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسانوں میں اجتماعیت، نظم وضبط اور قیادت کی جو شعوری کوششیں ہوتی ہیں قدرت نے پرندوں کی جبلّت میں وہ صلاحیت ودیعت کی ہے، مثلاً قاز پرندہ جب جھنڈ کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کرتا ہے تو جو قاز بطورِ قائد سب سے آگے ہوتا ہے وہ ہوا کے دباؤ کو سب سے زیادہ محسوس کرتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور دوسرا قاز پرندہ قیادت سنبھال لیتا ہے۔ جو پرندے پیچھے ہوتے ہیں وہ مسلسل آوازیں نکالتے ہیں، تاکہ رفتار برقرار رہے۔ اگر کوئی قاز دورانِ سفر بیمار ہو جائے، یا زخمی ہو جائے، یا کسی حادثے کا شکار ہو جائے اور زمین کی طرف گرنے لگے تو دو قاز اس کے ساتھ زمین کی طرف اس کی مدد کے لئے آتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں، تا آں کہ وہ صحت یاب ہو جائے، یا مر جائے۔ اس کے بعد ہی دونوں پرندے اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ ۲

پرندوں کی اڑان اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے

یہ پرندے جو کبھی پَر پھیلائے ہوئے اور کبھی پَر سمیٹے ہوئے فضا میں اڑتے ہیں، چکر لگاتے ہیں اور لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں، حسنِ فطرت کا شاہ کار ہیں۔ ان کو خدا کی قدرت فضا میں معلّق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کا مشاہدہ کرنے اور ان سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ — کیا یہ لوگ ان پرندوں کو نہیں دیکھتے جو فضا میں معلّق ہیں۔ ان کو اللہ ہی کی قدرت روکے ہوئے ہے۔ بے شک

يُؤْمِنُونَ (النحل:۷۹) اس میں نشانی ہے مومنوں کے لئے۔

اسی کرشمۂ الٰہی کا تذکرہ دوسری جگہ قرآن میں اس طرح آیا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَ يَقْبِضْنَ ،مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيْرٌ (الملک:۱۹)

کیا یہ اپنے اوپر اُڑتے ہوئے پرندوں کو پَر پھیلائے اور سمیٹے نہیں دیکھتے۔ ان کو رحمٰن ہی روکے ہوئے ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

قدرت نے ان پرندوں کو تہہ دار پروں سے نوازا ہے جو ان کو موسمی انتہاؤں سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان کو قوتِ پرواز بھی عطا کرتے ہیں۔ عام طور پر پَروں کی تین تہیں ان میں پائی جاتی ہیں۔[۳]

یہ پرندے لمحہ دو لمحہ نہیں، بلکہ گھنٹوں اور ہفتوں ہوا میں پرواز کر سکتے ہیں۔ نقلِ مکانی کرنے والے پرندے زمین پر اترے اور کسی پیڑ یا پہاڑ پر دم لیے بغیر بھی ایک مقام سے دوسرے مقام کا مسلسل سفر کرتے ہیں۔ چناں چہ مشرقی سائبیریا کا ایک پرندہ پلوور (PLOVER) موسمِ سرما میں جنوب کی طرف ہوائی (HEWAII) کے جزیروں میں جاتا ہے۔ چوں کہ راہ میں کوئی اور جزیرہ یا خشکی کا کنارہ نہیں ہے، اس لئے اس کا تمام سفر بلا رکے ہوئے بحرالکاہل پر پرواز کر کے ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ زمینی پرندہ تیرنا نہیں جانتا، اس لئے ڈھائی ہزار میل کا لمبا سفر ایک اڑان میں اور ۸۸ گھنٹوں میں مکمل کرتا ہے۔ تجربہ کے طور پر ایک پرندہ کو ویلنز میں پکڑ کر اس کی ٹانگ میں رنگ ڈالی گئی اور اسے بوستان، امریکہ میں لے جا کر چھوڑا گیا، ساڑھے بارہ دن کے بعد وہ تین ہزار میل سمندر کے اوپر سے گزر کر، جہاں کوئی نشانِ راہ نہ تھا، واپس اپنے گھر پہنچ گیا۔[۴]

اسی طرح بحرِ منجمد شمالی کا ایک پرندہ انٹک ٹرن (ANTICTERN) موسمِ سرما میں گرین لینڈ اور بحرِ اوقیانوس سے پرواز کرتا ہوا برطانیہ، اسپین اور وہاں سے ساحلِ افریقہ سے گزرتا ہوا بحرِ منجمد جنوبی میں پہنچ جاتا ہے اور موسمِ گرما گزار کر دوبارہ ۲۶ ہزار میل کا سفر مکمل کر کے بحرِ منجمد شمالی میں اپنے گھونسلوں میں واپس آجاتا ہے۔ یہ راہ

میں رکتا ہوا جاتا ہے۔۵

خود ہندوستان کے مختلف خطوں کی جھیلوں میں سائبریا سے نقلِ مکانی کر کے آنے والے ۳۵۰ قسم کے پرندے تقریباً سات ہزار کلومیٹر کا لمبا سفر طے کرتے ہیں اور گرمی کے موسم میں اسی رفتار سے واپس چلے جاتے ہیں۔ ۶

ایک ملک سے دوسرے ملک کا یہ لمبا سفر ہر سال کسی نقشہ، خوردبین، ریڈار اور انسانی رہنمائی کے بغیر طے کرنے والے یہ پرندے قدرتِ الٰہی کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔

پرندوں کے جسم کی بناوٹ، ان کی ہڈیوں اور تہہ دار پروں کی ساخت، ان کے جسم کا درجۂ حرارت، ان کے قد وقامت کا تناسب قدرت نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ تیز رفتاری سے ۸ ہزار میٹر تک کی اونچائی پر پرواز کر سکتے ہیں، پھر بھی اپنے جسم کو موسمی تغیرات سے محفوظ رکھتے ہیں، اپنی اڑان پر قابو رکھتے ہیں، گر کر ہلاک نہیں ہوتے اور نہ درجۂ حرارت کے گھٹنے بڑھنے سے متاثر ہوتے ہیں۔ قدرت نے اپنے فیضانِ رحمت سے ان پرندوں کو زندگی کے تحفظ اور قوتِ پرواز کا جو ملکہ دیا ہے اس کی عقدہ کشائی ماہرِ طیور ڈاکٹر سالم نے یوں کی ہے:

''پرندوں کا جسمانی درجۂ حرارت ۳۸ تا ۴۴ ڈگری سیلسیس کے درمیان ہوتا ہے، جو کہ زیادہ تر چوپایوں کے درجۂ حرارت سے زیادہ ہے، اسی کے ساتھ ان کے جسم پر موجود پروں کا خول، جو حرارت کی آمد و رفت روکے رکھتا ہے، انہیں بے انتہا سردی یا گرمی میں بھی زندہ رکھنے کی قوت دیتا ہے، پرندوں میں توانائی تبدیلی کی رفتار (Metabolic Rate) چوپایوں سے زیادہ ہوتی ہے، مگر ان کا جسم پسینہ پیدا کرنے والی قوت سے محروم رہتا ہے۔ اس صورت میں ان کے جسم سے چھوڑی جانے والی گرمی موسمِ گرما میں بخار اور گرمی کی زیادتی کی وجہ سے ان کی جان بھی لے سکتی ہے، مگر گرمی کی یہ زیادتی ان کے پھیپھڑوں اور جسم میں موجود ہوا کی تھیلیوں میں ضم ہو جاتی ہے۔ پرندوں کے جسم کے مختلف حصّوں میں پائے جانے والے یہ ہوا کے تھیلے اندرونی پسینے کو جذب کرنے کا کام دیتے ہیں۔ جسمانی نمی بھاپ بن کر خون کے ساتھ ان تھیلوں میں آتی ہے اور پھیپھڑوں کے

ذریعے باہر نکل جاتی ہے۔ پرندوں میں ایسی تقریباً ۹ جوڑی ہوا کی تھیلی ہوتی ہیں، جو ان کی لمبی اڑان یا پانی میں غوطہ لگانے میں بھی کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں'' ۔

پرندے بھی اللہ کی تسبیح کرتے ہیں

انسان اشرف المخلوقات ہے اور اللہ نے اسے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسے اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح وتقدیس کی تعلیم دی ہے اور انسانوں کا بڑا حصہ یہ کام کرتا ہے، مگر یہ صرف انسان ہی کی خوبی نہیں کہ وہ اللہ کی حمد وتسبیح کرے، دوسری مخلوقات بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، یہاں تک کہ پرندے بھی اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (النور:۴۱)

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں۔ ہر ایک اپنی نماز و تسبیح کا طریقہ جانتا ہے اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ ان سب سے باخبر ہے۔

اس آیت میں دوسری چیزوں کے ساتھ خاص طور پر پرندوں کی تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ہر مخلوق کی نماز اور تسبیح کا اپنا طریقہ ہے جسے اللہ جانتا ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان اسے جانے اور سمجھے۔ قرآن میں دوسری جگہ ان مخلوقات کی تسبیح کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ (الاسراء:۴۴) انسانو، تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

مگر یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ پرندے تکوینی طور اللہ کی حمد وتسبیح کرتے ہیں، ان کو حکم نہیں دیا گیا ہے۔ انسان کو حکم بھی دیا گیا ہے، تو کیوں نہ وہ پرندوں سے سبق لے اور اللہ کی حمد وثنا کرے۔

حضرت داؤد علیہ السلام جب خوش الحانی سے اللہ کی حمد وثنا کرتے تھے تو پرندے بھی ان کے ہم ساز ہو جاتے تھے۔ قرآن پاک میں سورہ انبیاء، سورہ ص اور سورہ سبا

میں اس کی تفصیل مذکور ہے۔ ارشاد ہے:

وَسَخَّرنَامَعَ دَاوٗدَ الجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ وَکُنَّافٰعِلِیْنَ (الانبیاء:۷۹)

داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے۔

زندگی کے مختلف مرحلوں میں پرندوں نے انسان کی سبق آموزی کا کام کیا ہے۔ چناں چہ آدم سے لے کر آج تک انسان پرندوں سے زندگی اور کائنات کے رموز سیکھنے میں مدد حاصل کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبیوں کی تعلیم و تربیت میں بھی پرندوں کا استعمال کیا ہے۔ موجود عہد میں مطالعہ اور مشاہدہ کی جدید سہولتوں نے سبق آموزی کا دائرہ بہت وسیع اور عمیق کر دیا ہے۔ بقول اقبال۔

نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

حیات بعد الموت کا فلسفہ پرندوں کے ذریعے سمجھایا گیا

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے ایک مرتبہ یہ التجا کی کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ مجھے اس کی حقیقت دکھا دے۔ اللہ نے پوچھا: ''کیا تجھے میری قدرت پر یقین نہیں ہے؟'' حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا: ''بلا شک یقین تو ہے، مگر میں اطمینانِ قلب کی خاطر جاننا چاہتا ہوں۔ تب اللہ نے حکم دیا:

فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (البقرۃ:۲۶۰)

چار پرندے لے لو، پھر ان کو اپنے سے مانوس کر لو، پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو، پھر ان کو پکارو، وہ دوڑتے ہوئے تمھارے پاس آجائیں گے، جان لو اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے علامہ ابنِ کثیرؒ نے ان پرندوں کے نام بھی دیے ہیں جن میں کبوتر، مور، مرغ، اور کوّا یا مرغابی شامل ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ ''ان پرندوں کو ذبح کر کے ان کے اجزائے بدن مختلف پہاڑوں پر رکھ دو'' اور

بعض نے یہ سمجھا ہے کہ ''ان کو زندہ مختلف پہاڑوں پر رکھ دو، پھر آواز دو''۔ جب چند دن کی پرورش کے بعد یہ پرندے تم سے اس حد تک مانوس ہو جاتے ہیں کہ دُور دراز کے پہاڑوں پر ہوں، تب بھی تمھاری ایک آواز پر دوڑتے ہوئے آجاتے ہیں، حالاں کہ تم نے ان کو صرف سدھایا ہے، پیدا نہیں کیا ہے۔ اسی سے اندازہ کرلو کہ وہ روحیں جن کو تمھارے رب نے پیدا بھی کیا ہے، پرورش بھی کی ہے، وہ جب ان کو پکارے گا اور اپنے یہاں بلائے گا تو کس طرح اپنی قبروں سے نکل کر اس کے پاس دوڑتی ہوئی آجائیں گی۔

حضرت ابراہیمؑ کے مشاہدۂ حیات بعد الموت کے مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ چوپایوں اور دیگر مخلوقات کو منتخب کرنے کا بھی حکم دے سکتا تھا، مگر پرندوں کا انتخاب غالباً اس لئے کیا گیا کہ پرندے سبک رفتار، کم جسامت اور جلد مانوس ہونے والے ہوتے ہیں۔ پرندوں کو پکڑنے، ان کو سدھانے اور ان کو اپنے استعمال میں لانے کا رجحان ابتدائے زمانے سے انسانوں میں رہا ہے۔ متمدن زندگی سے پہلے انسان جب شکاری زندگی کا عادی تھا، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پرندوں کی اس تمثیل نے حیات بعد الموت کا فلسفہ سمجھانے میں کتنا موثر کردار ادا کیا ہوگا؟ آج بھی طوطا، کبوتر، مرغ، مینا، تیتر اور باز کو سدھا کر ان سے خدمت لینے کا رواج ہمارے سماج میں موجود ہے۔ سدھائے ہوئے پرندے اپنے مالک کی آواز کو پہچانتے ہیں اور اسی طرح اس کا حکم بجالاتے ہیں جیسے وہ عقل وخرد رکھنے والی مخلوق ہوں۔ اسی خصوصیت نے ان کو فلسفہ بعد الموت کی گتھی سمجھانے میں موثر بنا دیا۔

مردہ کی تدفین کا طریقہ انسان کو پرندے کے ذریعے سمجھایا گیا

پرندوں کے ذریعے حیات بعد الموت کا فلسفہ ہی نہیں سمجھایا گیا، بلکہ انسانوں کو اپنے مردوں کی تدفین کا طریقہ بھی سکھایا گیا۔ حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں (قابیل اور ہابیل) میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوا۔ قابیل نے دست درازی کرتے ہوئے اپنے بھائی ہابیل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غیظ وغضب سے مغلوب ہو کر قتل تو کر بیٹھا، مگر اس کی سمجھ

میں نہ آیا کہ اب اس لاش کا کیا کرے؟ تب اللہ نے ایک کوّے کو قابیل کا معلم بنا کر بھیجا۔ قرآن میں ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِي سَوْءَةَ اَخِيْهِ قَالَ يٰوَيْلَتٰى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ (المائدۃ:۳۱)	پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا، تاکہ اسے بتائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے؟ یہ دیکھ کر وہ بولا: ہائے افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بننے سے عاجز رہا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا سکتا، پھر وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔

جب قاتل بصیرت سے محروم تھا اور اپنے بھائی کی لاش کو ٹھکانا لگانے کے لئے حیران تھا تب کوّا اس کا معلم بن کر آیا۔ اس نے زمین کھود کر دفن کرنا سکھایا اور قاتل کو احساس دلایا کہ کوّا اس سے کہیں بہتر ہے جس نے اسے دفن کرنے کا سلیقہ سکھا دیا۔ پرندہ کی اس رہنمائی کے بعد سے آج تک انسان اسی طریقہ پر عمل کرتا چلا آیا ہے۔ مُردوں کی لاش کو ٹھکانا لگانے کا معقول اور مہذب طریقہ یہی ہے۔

پرندہ کے ذریعے حضرت موسیٰؑ کی تربیت کی گئی

سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کی ملاقات اور دریائی سفر کا دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ اس قصہ کی مزید تفصیل صحیح بخاری میں آئی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ایک مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔ کسی نے پوچھا: ''سب سے بڑا عالم کون ہے؟'' حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: ''میں''۔ بظاہر یہ جواب غلط نہیں تھا، کیوں کہ نبی سے بڑا عالم کون ہوسکتا ہے؟ مگر اللہ نے اسے ناپسند فرمایا۔ بہتر جواب یہ ہوتا کہ اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ تب اللہ نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ میرے بندے خضر سے دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ ملاقات کرو، وہ تم سے بڑا عالم ہے۔ موسیٰؑ اپنے شاگرد یوشع بن نون کو ساتھ لے کر دریا کے کنارے چلتے رہے۔ ایک جگہ آرام کے لئے رکے تو تھیلی سے مردہ مچھلی

غائب ہوگئی اور سمندر میں چلی گئی۔ پھر اٹھ کر چلتے رہے۔ بھوک لگی تو مچھلی کے بارے میں دریافت کیا۔ شاگرد نے مچھلی غائب ہونے کا واقعہ سنایا اور وہ پلٹ کر اس جگہ آئے تو وہاں حضرت خضر موجود تھے۔ خضر نے ان کو ساتھ لیا اور کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی دریا میں رواں ہوگئی۔ جس وقت یہ حضرات کشتی میں سفر کر رہے تھے اسی وقت ایک چڑیا آئی، دریا میں چونچ ماری اور اڑ گئی۔ حضرت خضر نے موسیٰؑ کو مخاطب کر کے کہا: ''آپ نے دیکھا، اس پرندے نے دریا میں چونچ ماری، اس کی چونچ کی میں سمندر کا کتنا پانی لگا؟ اللہ نے انسان کو جو علم عطا کیا ہے اس کا تناسب خدا کے علم سے اتنا بھی نہیں جتنا کہ سمندر کے پانی کا پرندہ کی چونچ سے ہے''۸۔ حضرت موسیٰؑ اللہ کے علم کی وسعت سے آگاہ ضرور تھے، مگر اس موقع پر ان کو جو نصیحت ملی اس میں سائل کے اس سوال کا جواب بھی تھا کہ سب سے بڑا عالم کون ہے؟

حضرت یوسفؑ نے پرندہ کی تعبیر بتائی

حضرت یوسفؑ کو عفت و پاک دامنی کی سزا میں جب ان کی مالکہ نے جیل بھجوادیا تو وہاں دو اور قیدی آگئے جن پر بادشاہ کے خلاف سازش کا الزام تھا۔ ان دونوں قیدیوں نے خواب دیکھا اور اس کی تعبیر حضرت یوسفؑ سے پوچھی۔ ایک نے خواب دیکھا کہ وہ شراب نچوڑ رہا ہے اور دوسرے نے دیکھا کہ اس کے سر پر روٹی کا ٹوکرا ہے جس سے پرندے کھا رہے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا: شراب دیکھنے والا تو بری ہو جائے گا اور اپنی نوکری پر بحال ہو کر بادشاہ کے لئے جام و پیمانہ بھرے گا، مگر پرندے کو روٹی کھاتے ہوئے دیکھنے والا سزایاب ہوگا، اس کو پھانسی دی جائے گی اور پرندے اس کی بوٹی نوچ کر کھائیں گے۔ سچ مچ ایسا ہی ہوا۔ حضرت یوسفؑ کو اللہ نے خواب کی تعبیر کا علم عطا کیا تھا۔ اس دائرہ میں پرندے کا آنا بھی ان کی معلومات کا حصہ تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کو پرندہ کی تخلیق کا معجزہ ملا تھا

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بہت سے معجزات عطا فرمائے تھے۔ گھروں میں

جمع کی ہوئی چیزوں کا علم رکھنا، اندھے اور کوڑھی کو شفایاب کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا اور پرندوں کو حیات دینا وغیرہ۔ بلکہ پیدائش سے وفات تک حضرت عیسیٰؑ کی زندگی خود ایک معجزہ تھی۔ قرآن میں ان کے معجزات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

اَنِّی اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْراً بِاِذْنِ اللّٰہِ (آل عمران:۴۹)	میں تمھارے لئے پرندوں کی صورت بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں اور وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔

قرآن میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ وہ پرندہ، جو حضرت عیسیٰؑ تخلیق کرتے تھے، حقیقی پرندوں کی طرح اڑ جاتا تھا اور افزائش نسل کرتا تھا، یا بننے کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی انسان یا حیوان کی تخلیق کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ قرآن میں اس کے بارے میں یہ مذکور ہے۔ البتہ ان کے معجزات میں پرندہ سازی کا تذکرہ متعدد مقامات پر موجود ہے۔ پرندوں کی شکل بنانا اگرچہ آسان ہے، مگر روح پھونکنا ناممکنات میں سے ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزے نے اس کو طیارہ کی طرح ممکن بنا کر پیش کر دیا۔

حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولیاں سکھائی گئیں

حضرت سلیمانؑ کی قوت و شوکت کا تذکرہ بائیبل اور قرآن دونوں میں موجود ہے۔ ان کی برّی، بحری اور فضائی فوجوں میں جن و انس اور پرندے شامل تھے۔ یہ تینوں مخلوقات ان کے تابع فرمان تھیں اور وہ پرندوں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ سورۂ نمل میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

قَالَ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ وَاُوْتِیْنَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (النمل:۱۶)	سلیمانؑ نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئیں۔

بعض مفسرین نے یہ سمجھ کر کہ پرندوں کی بولی انسان کی سمجھ سے باہر ہے،

منطق الطیر کی تفسیر تیز رفتار گھڑ سواروں سے کی، لسانی طور پر جس کا کوئی جواز نہیں۔ عقلی اور سائنسی لحاظ سے پرندوں کی بولیاں، ان کی عادات واطوار اور دلچسپیوں کو سمجھنا اور ان کو اپنے کام کے لئے استعمال کرنا سب کچھ ممکن ہے۔ پرندوں کے عالمی شہرت یافتہ ماہرِ طیور ڈاکٹر سالم علی نے اپنی کتاب *The Book of Indian Birds* میں لکھا ہے:

''بسا اوقات انسان بھی پرندوں کی زبان سمجھ سکتا ہے۔ اگر کسی پرندے کا دیر تک مشاہدہ کیا جائے تو ان کی بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اور شاید حضرت سلیمانؑ کا بھی ایسا ہی تجربہ رہا ہوگا'' ۹

ڈاکٹر سالم علی کے ممتاز شاگرد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ وائلڈ لائف کے صدر شائق احمد یحییٰ نے پرندوں کے ایک مشاہدہ کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے:

''ایک بار کیرالا کے پریار ٹائیگر ریزرو میں بارہ سنگھ چڑیا کے ایک جوڑے کا مشاہدہ کر رہا تھا، جو ایک درخت میں گھونسلہ بنائے ہوئے تھا۔ اس کے اوپر ایک سوراخ تھا، جس پر قبضہ کرنے کے لئے ایک دن دو قسم کی مینا اور ایک جوڑا کٹ کھودی چڑیا میں زبردست لڑائی ٹھن گئی۔ کل چھ چڑیا یعنی چار مینا اور دو کٹ کھودی کافی دیر تک لڑتی رہیں اور شور مچاتی رہیں۔ میں خاموشی سے اس دلچسپ لڑائی سے محظوظ ہوتا رہا۔ اتنے میں ایک جوڑا بلبل کا کہیں سے آگیا اور خوب چہچہایا، اوپر نیچے اڑا اور چند منٹ کے اندر سارا ماحول پرسکون ہوگیا۔ ایسا لگا کہ بلبل کے جوڑے نے امن کمیٹی کے ممبر کا رول ادا کیا اور جھگڑے کو نپٹا دیا۔ پرندوں کی ایسی لسانی سمجھ کو کیا نام دیا جائے۔'' ۱۰

حضرت سلیمانؑ پرندوں سے سراغ رسانی کا کام لیتے تھے

پرندوں سے پیغام رسانی اور سراغ رسانی کا کام قدیم زمانہ سے لیا جاتا رہا ہے۔ ریل گاڑیوں، کاروں اور ہوائی جہاز جیسی تیز رفتار سواریوں سے پہلے پرندے، خاص طور پر کبوتر تیز رفتار پیغام رسانی کے لئے استعمال کیے جاتے تھے۔

حضرت سلیمانؑ کے لئے پیغام رسانی کا کام ہدہد پرندہ انجام دیتا تھا۔ انھوں نے

ایک موقع پر جب پرندوں کا جائزہ لیا تو ہدہد غائب تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا: ''یا تو وہ اپنی غیر حاضری کی معقول وجہ ظاہر کرے، ورنہ اسے سزا دی جائے گی، یا ذبح کر دیا جائے گا''۔ پرندہ جب حاضر ہوا تو اس نے اپنی غیر حاضری کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ملکِ سبا کی خبر لانے گیا تھا، جس پر ایک عورت حکومت کرتی ہے اور وہ سورج کی پرستار ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اس خبر کی تصدیق کے لئے اسے ایک خط دے کر بھیجا کہ اسے ملکہ کو دیا جائے اور اس کے ردِعمل سے مطلع کیا جائے:

اِذْهَبْ بِكِتٰبِي هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (النمل:۲۸)	میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔

چناں چہ ہدہد خط لے کر گیا۔ جواب میں ملکہ نے پہلے اپنا سفیر تحفہ کے ساتھ بھیجا، پھر حضرت سلیمانؑ نے اس کا تخت منگوا لیا اور وہ خود بھی حاضر خدمت ہوئی۔ اس قصہ کی تفصیل سورہ النمل میں موجود ہے۔

پرندوں نے فضائی فوج کا کارنامہ انجام دیا

حضرت محمد ﷺ کی ولادت سے پہلے یمن کا حکمراں ابرہہ اشرم خانۂ کعبہ کو ڈھانے کے لئے ہاتھیوں کا لشکر لے کر جب مکہ مکرمہ میں گھسا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے پرندوں کا ایک لشکر بھیجا۔ یہ پرندے اپنی چونچ سے ہاتھیوں کے لشکر پر پتھر برساتے رہے، یہاں تک کہ ابرہہ کی فوج بھس کی طرح ڈھیر ہوگئی۔ اس واقعہ کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ، اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کا کیسا انجام کیا؟ کیا ان کی تدبیروں کو ناکام نہیں بنا دیا؟ اور ان کے اوپر پرندوں کے جھنڈ کو بھیجا جو ان پر

سِجِّيْلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (سورہ الفیل) — سنگِ گل برسا رہے تھے، پھر ان فوجوں کو کھائے ہوئے بھس کی طرح ڈھیر کر دیا۔

مطلوبہ رویہ

ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے محل ہوگا کہ قدرت کی تخلیق کے جو کرشمے ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں ان میں عبرت و سبق آموزی کے ان گنت پہلو موجود ہیں جو ہر صاحبِ عقل و فہم کو تفکر و تدبر اور تحقیق و جستجو کی دعوت دیتے ہیں۔ پرندے بھی اسی کرشمۂ تخلیق کا حصہ ہیں، مگر بدقسمتی سے قدرت کے ان آثار کے متعلق ہمارا رویہ عملاً ان منکروں جیسا ہو گیا ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف:۱۰۵) — آسمانوں اور زمینوں میں کتنی ہی نشانیاں ایسی ہیں جن پر سے یہ لوگ گذرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔

آثارِ قدرت اور تحقیقِ الٰہی میں غور و فکر اور تدبر و تحقیق کی روایت ابھی تک ہمارے مذہبی معاشرہ میں کمزور ہے۔ خوش اعتقادی کے طور پر ہم ضرور کہتے ہیں کہ ہر چیز کا علم قرآن میں موجود ہے، مگر اس سے تحریک و رہنمائی حاصل کر کے آثارِ قدرت کی تحقیق و جستجو میں سرگرمِ عمل رہنا ہماری ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کلامِ الٰہی کے ان پہلوؤں پر غور و فکر کی تحریک عام کی جائے۔

حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر سالم علی، The Books of Indian Birds، ممبئی ۱۹۹۷ء

۲۔ عبدالرشید صدیقی، پرندوں کی نقلِ مکانی، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، جون ۲۰۰۱ء، ص ۵۳

۳۔ ڈاکٹر سالم علی، حوالہ سابق، ص xviii

۴۔ عبدالودود، مظاہرِ فطرت اور قرآن، لاہور؛ جون ۲۰۰۱ء

۵۔ عبدالرشید صدیقی، حوالۂ سابق، ص ۵۱

۶۔ ڈاکٹر سالم علی، حوالہ سابق، ص ۳۲۱

۷۔ ایضاً، ص xviii

۸۔ بخاری، کتاب العلم، باب ما یستحب للعالم اذاسئل: أی الناس أعلم ؟فیکل العلم الی اللّٰہ

۹۔ ڈاکٹر سالم علی، حوالہ سابق، ص xxiv

۱۰۔ حافظ شائق احمد یحییٰ، پرندے اوران کی خصوصیات، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۲۰۰۳ء

وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام

مولانا سلطان احمد اصلاحی

جدید ہندوستان میں وحدتِ ادیان کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے جس کی رو سے تمام مذاہب برحق اور منزلِ مقصود تک پہنچانے والے ہیں۔ اس طرح اس کے ذریعے بندگانِ خدا کو اسلام جیسے سچے اور اللہ کے آخری دین سے دور رکھنے کی دانستہ یا نادانستہ طور پر کوشش کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس فلسفہ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے اس فلسفہ کے پس منظر اور اس کے مضمرات سے بحث کی ہے، اور دوسرے باب میں اس کا بطلان واضح کرتے ہوئے اسلام کی حقانیت کو بدلائل ثابت کیا ہے اور احترام مذہب کے صحیح مفہوم کی نشان دہی کی ہے۔

آفسیٹ کی حسین طباعت، جاذب نظر ٹائٹل، صفحات: ۱۹۲ قیمت =/۴۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

اِحسان وتصوف کے بعض اصولی مباحث

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مولانا مودودیؒ کا مطالعہ

ڈاکٹر عبید اللہ فہد

مضمون نگار ڈاکٹر عبید اللہ فہد کا اندازِ نگارش کہیں کہیں سخت ہو گیا ہے۔ تصوف کے قائلین اور اس کے ہمدردوں کو یہ ناگوار گزر سکتا ہے۔ ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے ہر ایک سے اتفاق کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ علمی مباحث میں اتفاق اور اختلاف کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ علمی شخصیات ہم سب کا سرمایہ ہیں۔ ان کا احترام لازمی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان کے افکار و خیالات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ بھی ہوتے رہنا چاہئے۔ اس سے استفادے کی بہتر صورتیں نکل سکتی ہیں۔ جو اصحاب علم اس موضوع پر یا اس جیسے موضوعات پر سنجیدہ اظہارِ خیال کرنا چاہیں ان کے لئے تحقیقاتِ اسلامی کے صفحات حاضر ہیں (جلال الدین)

اصطلاحات کے سلسلے میں شریعت کا موقف

قرآن کریم کے تصورِ 'تزکیہ' اور حدیثِ نبوی کی اصطلاحِ 'اِحسان' کے لیے ہی اگر تصوف وسلوک اور طریقت ومعرفت کی اصطلاحیں دوسری صدی ہجری میں وضع کی گئیں، دینِ اسلام کی روح ومغز پر ہی زور دیا گیا اور صوفیا نے اسی علم کو علم باطن کا نام دیا [۱] اور اس کے ماہر اور عامل سالک وصوفی قرار پائے [۲] تو سوال یہ ہے کہ قرآن کی آیت وَيُزَكِّيهِمْ (البقرۃ :۱۲۹؛ الجمعہ :۲) کی اصطلاح کیوں نہ باقی رکھی گئی؟ اور حدیثِ پاک کے لفظ 'اِحسان' کی ترجمانی کیوں کافی تصور نہ کی گئی؟

شریعت میں مفاہیم وتصورات کے ساتھ الفاظ واصطلاحات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔شریعت نے اپنے مخصوص افکار ونظریات اور عقائد وتصورات کی تفہیم وترسیل کے لیے مخصوص اصطلاحیں استعمال کی ہیں جن میں قرآن مجید اور سنتِ مطہرہ کے ان اقدار وافکار کا بھرپور انعکاس ہے جو ان کے پیش نظر ہیں۔صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، شعائر، سنت، حدیث، صفا، مروہ، طواف، سعی، ذبح نحر، تزکیہ، احسان یہ سب وہ اصطلاحیں ہیں جن کے معنٰی و مراد الہامی نصوص میں متعین ہیں۔جب بھی ان اصطلاحات کی جگہ دوسری اصطلاحیں استعمال کی جائیں گی، معنٰی ومفہوم میں فرق واقع ہو جائے گا اور تحریف وانحراف کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہے گی۔اسی لیے قرآنِ کریم نے ایسے الفاظ واصطلاحات کے استعمال کو ناپسند کیا ہے جن سے کسی غلط فہمی یا متضاد معانی کے ابلاغ کا خدشہ ہو۔کوئی لفظ صحیح اور غلط دونوں معانی میں اگر مشترک ہو اور دشمنانِ اسلام اشتراکِ لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کرنا چاہتے ہوں تو اس لفظ کا استعمال ہی ترک کر دینا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (البقرۃ:۱۰۴) [۳]	اے ایمان لانے والو، راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو اور توجہ سے بات سنو، کافر تو عذابِ علیم کے مستحق ہیں

دورِ جدید میں اسلام کے سیاسی، سماجی، اور عمرانی نظریات کی تفہیم کے لیے سوشلزم، اشتراکیت، نیشنلزم، سیکولرزم اور ڈیموکریسی کی اصطلاحیں جب مستعار لی گئیں اور اسلامی ادبیات میں ان کا استعمال شروع ہوا تو علماء اسلام کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ مغربی اصطلاحیں اسلامی اقدار وافکار کے لیے اجنبی ہیں اور اسلامی شریعت نے اپنے افکار ونظریات کی ترسیل کے لیے اپنی اصطلاحیں رکھی ہیں تو اجنبی اصطلاحات درآمد کیوں کی جائیں؟ مزید یہ کہ ہر اصطلاح اپنا ایک سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر رکھتی ہے جس سے علیحدہ کر کے اسے دیکھا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ [۴]

خیال ہوتا ہے کہ تصوف میں اشراقی، رواقی، زردشتی اور ویدانتی فلسفوں کی جو

آمیزش ہوئی ، ہندو جوگیوں اور عیسائی راہبوں کے طور طریقے اس میں شامل ہوئے ، مشرکانہ تخیلات واعمال تک اس میں خلط ملط ہو گئے اور شریعت اور طریقت ومعرفت الگ الگ چیزیں بن گئیں ، بلکہ یہ ایک دوسرے سے بے تعلق اور متضاد نظر آنے لگیں اور اسلامی شریعت کے علی الرغم ایک متوازی نظام وجود میں آ گیا تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تصوف کی اٹھان ہی غلط طریقے سے ہوئی تھی ۔ اس کے فکری سوتے قرآن وسنت کے ماسوا تھے ۔ اس کی اصطلاحات ، احوال ومقامات ، منہاجیات اور اصول وقواعد سب اسلام کے لیے اجنبی تھے اور اسی لئے ہر قسم کی تحریف وتلبیس نے تصوف کو محفوظ پناہ گاہ تصور کیا اور غیر اسلامی افکار واقدار اس کی راہ سے مسلم امت میں جلد سرایت کر گئے ۔

یہ الم ناک صورت حال شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے دور میں موجود تھی ، اسی لیے وحدت الوجود پر ایمان رکھنے کے باوجود انہیں ارباب تصوف کی بداعتقادیوں اور بے عملیوں کی خبر لینی پڑی ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

''میں ان پیرزادوں سے ، جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں ، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں ؟ کیوں تم میں سے ہر شخص ہر طریقے پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقے کو چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد ﷺ پر اتارا تھا ؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے ، اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ہادی ومہدی سمجھتا ہے ، حالاں کہ وہ ضال ومضل ہے ۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں ، یا اس لئے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراضِ دنیوی حاصل کریں یا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشاتِ نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں ۔ یہ سب رہزن ہیں ، دجّال ہیں ، کذّاب ہیں ، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے دے رہے ہیں .....

''میں ان متقشف واعظوں ، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدّعیو ! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے ۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا ، تم نے خلقِ خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا ، حالاں کہ تم

فراخی کے لیے مامور تھے، نہ کہ تنگی کے لیے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو مدار الیہ بنالیا ہے، حالاں کہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں!''۵

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) جو خود ایک خاندانِ تصوف سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا سلسلہ حضرت خواجہ قطب الدین مودودؒ سے ملتا ہے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (م ۱۲۳۶ء) کے دادا پیر تھے۔ آپ کے خاندان میں آپ کے والد مرحوم سیّد مولوی احمد حسینؒ تک بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا مودودیؒ نے صوفیا کی صحبتوں سے اکثر استفادہ کیا تھا اور متعدد صوفی بزرگوں سے توجہ لینے اور اشغال سیکھنے کی بھی کوشش کی تھی، مگر صوفیا کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ وہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کر کے ایمان بالشہادۃ کی دولت پانا چاہتے ہیں، جب کہ یہ کوشش فضول بھی ہے اور غلط بھی اور اس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ صوفیا کے تزکیۂ نفس کے مقصد ''روحانی ترقی'' پر بھی سوال قائم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اس سے فروتر تزکیۂ نفس کا جو مقصد بتایا جاتا ہے وہ روحانی ترقی ہے، مگر یہ روحانی ترقی کچھ ایسی مبہم اور پُراسرار چیز ہے کہ تمام عمر اس بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا۔ اس کی اصطلاحیں، اس کی منزلیں، اس کے ثمرات ونتائج سب مرموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جاسکتی ہے جس کو ابوبکرؓ اور عمرؓ نے طے کیا تھا۔

''اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد ان لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حصول چاہتے ہیں، لیکن یہاں ایک مصیبت پیش آجاتی ہے، اور وہ یہ کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بیش تر اصحاب کے نزدیک تو تقویٰ سے مراد محض لباس، وضع قطع، نشست وبرخاست، اکل وشرب وغیرہ امور کے متعلق اس

ظاہری نقشہ پر اپنی زندگی کو ڈھال لینا ہے جس کی جزئیات احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ نیز چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادات کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے تقویٰ کی اس ظاہری شکل کو اختیار کر لیا ہے انہیں متقی کہا اور سمجھا جاتا ہے اور وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اندر تقویٰ پیدا کر لیا ہے، حالاں کہ فی الحقیقت روحِ تقویٰ کی ان میں بہت کمی ہوتی ہے اور بسا اوقات عملی زندگی کی آزمائشوں میں ایسی ایسی غیر متقیانہ حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جن کی بدولت تقویٰ کی اس ظاہری شکل کا بھرم بھی جاتا رہتا ہے'' [۲]

احسان اور تصوّف کے درمیان فرق

اربابِ تصوف نے بالعموم اور مصلحینِ تصوف نے بالخصوص 'احسان' اور 'تصوف' کو ہم معنیٰ قرار دیا ہے جو پوری طرح درست نہیں ہے۔ اِحسان حدیثِ جبریل کا لفظ ہے جس کی تعریف رسولِ مقبول ﷺ کی زبان سے اللہ نے خود فرمادی ہے:

أن تعبداللّٰه كانك تراه ، فإن لم تكن تراه فانه يراك [۳]	تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے بچشم خود دیکھ رہے ہو اور ایسی کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو یقین رکھو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

یہ عبادتِ الٰہی اور تقربِ خداوندی کی وہ اعلیٰ ترین صفت و کیفیت ہے جو ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہے۔ روحانیت کی یہ معراج عبادت کی بجا آوری اور فرائض کی انجام دہی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ حدیثِ نبوی کے الفاظ أن تعبداللّٰه صراحت کرتے ہیں کہ عبادت کو ترک کر کے اور فرائض سے پہلو تہی کر کے روحانیت کا حصول ممکن نہیں ہے اور اگر کوئی عبادت کی بجا آوری سے بالاتر ہو کر روحانیت، تقویٰ یا تزکیہ کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اِحسان کے نبوی مفہوم سے اِبا کرتا اور شریعت سے کھلواڑ کرتا ہے۔

حدیثِ جبرئیل کا 'اِحسان' ایمان و اسلام کا ترقی یافتہ مرحلہ ہے جس تک رسائی اُسی شخص کی ہو سکتی ہے جو عقائد و ایمانیات میں راسخ اور مستحکم ہو، جو اللہ پر، اس کے رسول پر،

اس کے فرشتوں پر، تمام الہامی کتابوں پر، یومِ آخرت پر اور تقدیرِ الٰہی پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہو، جس کا مضبوط عقیدہ ہو کہ خاتم المرسلین کی شریعت پر عمل کیے بغیر نجات نہیں مل سکتی اور دنیا اور آخرت میں فلاح وسعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اِحسان کے اس جامع نبوی مفہوم اور تصوف میں مکمل یکسانیت نہیں ہے۔ تصوف کی کتابوں اور صوفیا کے ملفوظات میں علمِ باطن، زہد ومجاہدہ، فقر وتجرد اور توکل وغیرہ کی جو تشریح کی گئی ہے وہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتی۔ بلاشبہ قرآن وسنت میں نفس کو قابو میں کرنے کی بار بار تاکید ہے اور تصوف کے تمام اعمال واشغال کا مقصود تزکیۂ نفس اور ضبطِ نفس ہی قرار دیا جاتا ہے، مگر یہ بات بہت اہم ہے کہ ضبطِ نفس اور تزکیہ کے لیے قرآن وسنت ہی کی تعلیمات اور واضح ہدایات پر عمل کیا جائے۔ تزکیہ کے لیے جو طریقے بھی اختیار کیے جائیں ان کا موافقِ سنت ہونا ضروری ہے۔ شریعت کی نگاہ میں مقصد کی پاکیزگی بے معنٰی ہے اگر اس کے حصول کے لیے اختیار کیا جانے والا وسیلہ بھی جائز، پاکیزہ اور موافقِ شریعت نہ ہو۔ آیتِ قرانی: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً الملک : ۲ (تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے) کی تفسیر حضرت فضیل بن عیاضؒ نے 'اخلص' اور 'اصوب' عمل سے کی ہے۔ لوگوں نے جب اخلص اور اصوب عمل کی وضاحت طلب کی تو فرمایا:

اذا کان خالصاً و لم یکن صواباً لم یقبل، و اذا کان صواباً و لم یکن خالصاً لم یقبل، حتی یکون خالصاً صوابا، و الخالص أن یکون للہ، و الصواب أن یکون علی السنة [۸]	عمل اگر خالص ہو مگر وہ درست نہ ہو تو مقبول نہ ہوگا اور اگر درست ہو مگر خالص نہ ہو تو بھی قبول نہ کیا جائے گا، تا آں کہ وہ خالص ہو اور درست بھی ہو۔ خالص کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے لیے ہو اور درست کے معنی یہ ہیں کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ [۹]

تصوف اور اِحسان کے درمیان اسی بیّن فرق کی وجہ سے غالباً شاہ ولی اللہؒ نے اکثر مقامات پر احسان ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

احسان اور فقہِ اسلامی

'اِحسان' کی تعریف کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ اسے شرعی فرائض واعمال کا ایک اہم رخ قرار دیتے ہیں جس کا راست تعلق تہذیبِ نفس سے اور نفس کو مطلوبہ صفات و کیفیات سے ہم آغوش کرنے سے ہے۔ تحریم وتحلیل کے پورے عمل میں شریعت کا محور اعمال اور شرعی مکلفات ہی ہیں جن کی دو جہتیں ہوتی ہیں: ایک جہت عوام الناس کو ان اعمال کا پابند بنانے کی ہے جس میں ظواہر کی بھرپور رعایت ہوتی ہے اور علی الاعلان ان کی بجا آوری اور تعمیل وتنفیذ مطلوب ہوتی ہے۔ اس جہت میں کسی فرار یا معذرت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں میانہ روی کے ساتھ تسلسل واستحکام ناگزیر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری جہت تہذیب وتزکیہ کی ہے جہاں کیفیات اور مطلوبہ مقامات سے بحث ہوتی ہے۔ اعمال کی کیفیت اور ان کی رسائی ومقبولیت پر نگاہ ہوتی ہے اور اس کا مدار وجدان پر ہوتا ہے۔ اسی کو فاضل مصنف 'علمِ اِحسان' سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ اول الذکر کو وہ 'علم شرائع' کا نام دیتے ہیں۔

گویا احسان پر گفتگو کرنے کے لیے دو پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے:

(۱) اعمال پر اس نقطۂ نگاہ سے نظر کی جائے کہ ان سے نفسی کیفیات پیدا ہو رہی ہیں اور قلب وروح پر خاطر خواہ اثرات مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں۔ بسا اوقات کوئی عمل ریا و نمود کے لیے انجام دیا جاتا ہے، یا معمول کی ایک کاروائی سمجھ کر اسے مکمل کیا جاتا ہے، یا اس میں تکبّر، ایذا دہی اور اظہارِ احسان کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں اور مطلوب کیفیت اور مقام تک رسائی پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیک عمل وجود میں آجاتا ہے، مگر نفسِ انسانی اس کا وہ اثر قبول نہیں کرتا جو ایک مردِ محسن کو قبول کرنا چاہئے، جیسے کوئی شخص فرائض پر اکتفا کرلے اور اس میں کمیت یا کیفیت کے اعتبار سے کوئی اضافہ نہ کرے تو وہ صاحبِ تزکیہ نہیں ہوسکتا۔

(۲) خود نفسی حالات وکیفیات پر تدبر کیا جائے، تاکہ ان کی کماحقہ معرفت

حاصل ہو سکے اور پوری بصیرت کے ساتھ اور مقصودِ اصلی کو سامنے رکھتے ہوئے اعمال انجام دیئے جائیں، گویا انسان اپنا طبیب آپ بن جائے ۱۰

شاہ ولی اللہؒ نے علم شرائع اور علم احسان میں جس طرح تفریق کی ہے بعینہٖ وہی تفریق مولانا مودودیؒ نے فقہ اور تصوف میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''فقہ کا تعلق انسان کے ظاہری عمل سے ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ تم کو جیسا اور جس طرح حکم دیا گیا اس کو تم بجالائے یا نہیں، اگر بجالائے ہو تو فقہ کو اس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ تمہارے دل کا کیا حال تھا۔ دل کے حال سے جو چیز بحث کرتی ہے اس کا نام تصوف ہے، مثلاً تم نماز پڑھتے ہو۔ اس عبادت میں فقہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ تم نے وضو ٹھیک کیا ہے، قبلہ رُو کھڑے ہوئے ہو، نماز کے ارکان ادا کیے ہیں، جو چیزیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب پڑھ لی ہیں اور جس وقت جتنی رکعتیں مقرر کی گئی ہیں، ٹھیک اسی وقت اتنی ہی رکعتیں پڑھی ہیں۔ جب یہ سب تم نے کر دیا تو فقہ کی رُو سے تمہاری نماز پوری ہو گئی۔ لیکن تصوف یہ دیکھتا ہے کہ اس عبادت میں تمہارے دل کا کیا حال رہا، تم خدا کی طرف متوجہ ہوئے یا نہیں؟ تمہارا دل دنیا کے خیالات سے پاک ہوا یا نہیں؟ تمہارے اندر نماز سے خدا کا خوف اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین، اور صرف اسی کی خوشنودی چاہنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا یا نہیں؟ اس نماز نے تمہاری روح کو کس قدر پاک کیا؟ تمہارے اخلاق کہاں تک درست کیے؟ تم کو کس حد تک سچا اور پکا عملی مسلمان بنا دیا؟ یہ تمام باتیں جو نماز کے اصل مقصد سے تعلق رکھتی ہیں جس قدر کمال کے ساتھ حاصل ہوں گی تصوف کی نظر میں تمہاری نماز اتنی ہی زیادہ کامل ہوگی اور ان میں جتنا نقص رہے گا، اسی لحاظ سے وہ تمہاری نماز کو ناقص قرار دے گا'' ۱۱

علمِ شرائع اور علم احسان میں یہ فرق دراصل شاہ ولی اللہؒ کی اس اصلاحی اسکیم کا ایک جزو ہے جس میں اعتدال، توازن اور میانہ روی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ اس طرح شریعت و طریقت کے دو متوازی دھاروں کو ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ کو تصوف کے نام اور اصطلاح سے گو بنیادی اختلاف ہے اور وہ تصوف کو

اسلامی کاز کے لیے نقصان دہ تصور کرتے ہیں، مگر تزکیہ وتربیت کے قرآنی تصور کا زبردست دفاع کرتے ہیں، جس کے بغیر اسلامی اخلاق کی عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی۔ ان کے نزدیک تزکیہ کا مطلب ''ایسے افراد تیار کرنا ہے جو متخلق باخلاق اللہ ہوں، صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ بن کر زمین میں کام کریں اور اس کام کے صلے میں اللہ کے تقرب سے سرفراز ہوں'' ۱۲

علم شرائع اور علم احسان یا بالفاظِ دیگر فقہ اور تصوف میں یہ تفریق وتقسیم ترسیل و تفہیم کے لیے تو کسی حد تک درست ہوسکتی ہے، مگر اصولی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی علانیہ دعوت تو فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصاً لَه الدِّيْنَ الزمر:۲ (لہٰذا تم اللہ کی بندگی کرو، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے) کی ہے۔ وہ وَاَنِيْبُوا اِلٰى رَبِّكُم وَ اَسْلِمُوا لَهٗ الزمر:۵۴ (پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ) پر زور دیتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ کی امتیازی صفت یہ ہے کہ یہ ظاہر و باطن دونوں کے احوال اور تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے، پھر اسے دو جدا جدا خانوں میں کیسے تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

اتباعِ شریعت پر اصرار

الطاف القدس میں شاہ ولی اللہؒ صوفیا کے اعمال واشغال اور آداب ورسوم سے بحث کرتے ہیں جن کی تفصیلات صوفی سلسلوں کے معمولات، کتابوں اور طریقوں میں ملتی ہیں۔ ان سے صوفیا احوال و مقامات سے ہم کنار ہوتے ہیں، مگر انسان کے جوارح کی تہذیب اور اس کے لطائف کی اصلاح اعمالِ شریعت سے ہوتی ہے، نہ کہ احوال ومقامات سے۔ لہٰذا مطلوب ومقصود شرع کے سوا کچھ نہیں کہ صورونوعیہ اسی کا تقاضا کرتی ہیں ۱۳

حجۃ اللہ البالغہ میں فاضل مصنف شریعتِ اسلامی پر عمل درآمد کو مرکز ومحور قرار دیتے ہوئے اہلِ جذب پر تنقید کرتے ہیں کہ تجرد، حسنِ معاشرت اور حسنِ مصاحبت کا اجتماع ان کے ہاں بہت مشکل ہے۔ اہل اللہ کی بڑی تعداد تجرد کی زندگی گزار دیتی ہے۔ وہ

عوام سے الگ تھلگ رہتے ہیں، بیوی بچوں کی مصروفیت سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور عام انسانوں سے کافی فاصلہ قائم رکھتے ہیں۔ دوسری طرف عام لوگ ہیں جو بیوی بچوں کے مسائل میں گھر کر ذکرِ الٰہی سے غافل ہو جاتے ہیں، جب کہ انبیائے کرام دونوں مصلحتوں کی رعایت رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ اسی لئے وہ ضبطِ نفس پر سب سے زیادہ قادر ہوتے ہیں اور دونوں طرح کی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔

یہاں شاہ ولی اللہؒ رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے خشوع وخضوع اور اخبات وانابت کی کیفیت کے تسلسل کے لیے اذکار ووظائف کا اہتمام کرنے کا حکم دیا، صبر ومصابرت اور انفاق کی تعلیم دی، موت کو یاد رکھنے اور آخرت کو مستحضر کرنے کی ہدایات دیں، دنیا اور متاعِ دنیا کی بے وقعتی ظاہر کی، عظمت وقدرتِ خداوندی پر تدبر وتفکر کرنے کی دعوت دی، مریض کی عیادت کرنے، نیکی وصلہ رحمی کرنے، سلام کو رواج دینے، حدود قائم کرنے اور معروف ومنکر کا فریضہ ادا کرنے کی تلقین کی، تاکہ وہ صفتِ عدالت سے متصف ہو سکیں۔ آپؐ نے ان تمام افعال واعمال اور کیفیات کو کھول کھول کر بیان کر دیا [۱۴]۔

مولانا مودودیؒ صحابۂ کرام کے طریقِ سلوک پر گفتگو کرتے ہوئے اتباعِ سنت کے اسی پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سلوک کے تمام مقامات اسی ذریعے سے طے کرنے چاہئیں جس سے نبی کریم ﷺ کی رہنمائی میں صحابہ کرامؓ نے ان کو طے کیا تھا، یعنی کلمۂ لا الہ الا اللہ کا فہم اور قلب وروح میں اس فہم کا تمکن اور پھر پوری زندگی پر اس کا ایسا حاوی ہو جانا کہ خیال وعمل میں اس سے یک سرِ مو انحراف نہ ہو۔ اسلام میں اگر کوئی طریقت یا تصوف ہے تو بس یہی ہے۔ اسی کو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ یہی چیز ہمارے اکابر تک پہنچی اور اسی کے ذریعے سے ایک مسلمان بلند مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔ حق تک پہنچنے کا راستہ بجز اس علمِ صحیح اور عملِ صحیح کے اور کوئی نہیں ہے۔ اگر ہمارے صوفیا اس طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے اور اسی کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرتے تو یہ قوم

اُن گمراہیوں میں مبتلا نہ ہوتی جنہوں نے اس کو دین اور دنیا دونوں سے کھو دیا"۔[۱۵]

صوفیائے کرام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس معاملہ میں ان کے یہاں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ وہ شریعت کے بالمقابل طریقت کے متوازی نظام کے علم بردار اور قدم قدم پر اصول و تعلیماتِ نبوی کی خلاف ورزی کرتے نظر آتے ہیں۔ صوفیا کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اربابِ ذوق اور اصحابِ وجد و حال کو ایک مخصوص علم عطا کرتا ہے جسے وہ علمِ لدنی یا علمِ باطن کہتے ہیں۔ زہد و مجاہدہ کا مطلب دنیا اور متاعِ دنیا سے بے رغبتی اور کنارہ کشی تک محدود نہ رہا، بلکہ دنیا اور اہلِ دنیا سے بغض و نفرت، عوام سے قطع تعلق اور رہبانیت کا اختیار کرنا ایک صوفی کے لیے ناگزیر ٹھہرا۔ اس سے آگے بڑھ کر نفس کشی اور مجاہدۂ نفس کے وہ طریقے اختیار کیے گئے جو سنتِ نبوی سے براہ راست متصادم تھے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ زہد یہ ہے کہ دنیا اور اہلِ دنیا سے بغض رکھو [۱۶] شیخ جنید بغدادیؒ تک کو کہنا پڑا کہ جو شخص اپنے دین کا بچاؤ اور قلب و بدن کا آرام چاہتا ہے وہ لوگوں سے علیٰحدگی اختیار کر لے [۱۷] خواجہ ابو محمدؒ نے اپنے مکان کے ایک گہرے کنویں میں الٹے لٹک کر مدتوں عبادت کی۔ [۱۸] شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے ایک مسجد کے کنویں میں چلۂ معکوس کھینچا اور چالیس روز تک کنویں کے کنارے ایک درخت پر اپنے آپ کو آویزاں کر کے صلوٰۃ معکوس ادا کی، جس کا حکم اُن کو ان نے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دیا تھا [۱۹]

اقامتِ عدل و اصلاح

شاہ ولی اللہؒ نے 'احسان' کی صفاتِ اربعہ میں ایک اہم صفت 'عدالت' قرار دی ہے جو ایک ایسی صلاحیت اور ملکہ کا نام ہے جو تدبیرِ منزل اور سیاستِ ملکی میں عادلانہ و مصلحانہ نظام کے بسہولت قیام میں معاون ہوتا ہے۔ فاضل مصنف اس صفت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی بنیاد وہ نفسی جبلّت ہے جس سے وہ جامع افکار اور سیاسی پروگرام جنم لیتے ہیں جو خدا اور اس کے فرشتوں کے نزدیک مناسب اور موزوں ہوتے ہیں۔ یہ تو مشیتِ الٰہی اور خدائی اسکیم ہے کہ عالم کا انتظام و انصرام ہو، لوگ ایک دوسرے کا

تعاون کریں، کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، باہم امداد واعانت کا نظم قائم ہو اور مسلمان جسدِ واحد کی مانند بن جائیں کہ ایک عضو کو تکلیف ہو تو دوسرے اعضاء درد و کرب محسوس کریں، آل و اولاد کی کثرت ہو، فساق و فجار کو سزا ملے اور عدل پرور کو انعام و اکرام سے نوازا جائے، فاسد رسوم و روایات پژمردہ ہوں اور خیر اور نوامیسِ حق کی بہتات ہو۔ خلقِ خداوندی میں یہ امر مقدّر تھا اور یہ سب قضاء الٰہی کی تشریح و تفصیل تھی۔ بارگاہِ قدوس کے مقرب فرشتوں نے بڑھ کر اس فیصلۂ خداوندی کا استقبال کیا۔ وہ مصلحین کے حق میں دعا اور مفسدین کے اوپر لعنت بھیجنے میں لگ گئے۔ شاہ ولی اللہؒ یہاں درج ذیل آیات سے استدلال کرتے ہیں:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَّعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور:۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے۔ اور ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، پس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (الرعد:۲۰)

اور ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے، انہیں برقرار رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس کفار کا طریقہ یہ بتایا گیا:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (الرعد:۲۵)

رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ دہلوی ان آیات کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو شخص ان مصلحانہ اعمال کو انجام دیتا ہے اسے رحمتِ خداوندی ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے اس پر درود اور سلام بھیجتے ہیں۔ عوام الناس کے درمیان اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اسے اللہ کی نصرت وحمایت ملتی ہے اور جو فساد پھیلاتا ہے اور مفسدانہ سرگرمیوں میں ملوث رہتا ہے اس پر فرشتے لعنت بھیجتے ہیں اور عوام الناس میں بھی قابلِ نفریں قرار پاتا ہے۔ ایسے شخص پر زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ صفتِ عدالت کے معاشرتی اور سماجی اثرات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کے قیام وقعود، بیداری ونیند، رفتار وگفتار، لباس و رہائش اور زیب وزینت میں جب عدالت کا اظہار ہوتا ہے تو اسے 'ادب' کہا جاتا ہے۔ مال کمانے اور اسے خرچ کرنے میں جب اس صفت کا ظہور ہوتا ہے تو وہ 'کفایت' کہلاتی ہے۔ تدبیرِ منزل پر اس کے اثرات پڑتے ہیں تو وہ 'حریت' میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب سیاستِ ملکی میں اس کا انعکاس ہوتا ہے تو وہ 'سیاست' سے موسوم ہوتی ہے۔ خیالِ خاطر احباب کے تقاضوں کی تکمیل میں جب یہ صفت ڈھلتی ہے تو اسے 'حسنِ معاشرت' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس صفت کے ظہور کے لیے ناگزیر ہے کہ ہمہ گیر افکار کے ساتھ وفاداری اور کامل متابعت پائی جائے اور قلب میں سختی نہ ہو، بلکہ اس میں سوز وگداز ہو اور رحمت ومودت ہر آن سایہ فگن رہے۔ [۲۰]

اِحسان کے معاشرتی واصلاحی تناظر پر شاہ ولی اللہؒ کی یہ گفتگو بڑی انقلاب انگیز

اور اثر آفریں ہے۔ وہ صوفیاء کرام کی عام روش سے ہٹ کر اصلاحِ معاشرہ، اقامتِ عدل اور خلافت کی تشکیل کا ایک جامع نظام اور منصوبہ مرتب کرتے ہیں۔ ان کا فلسفۂ احسان انہیں گوشہ گیری، عافیت کوشی اور انسانوں سے قطعِ تعلق اور معاشرہ سے بے نیازی کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ انسان کو عادل بنا کر نظامِ اصلاح وعدل کے قیام پر ابھارتا ہے۔

تزکیہ کا یہ پہلو مولانا مودودیؒ کے ہاں بہت نمایاں ہے۔ وہ خود تزکیہ کے اس مقام پر فائز تھے اور اقامتِ دین اور اقامتِ جہاد کے ناگزیر مراحل اور تقاضوں سے صبر و ثبات کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کو اعلیٰ ترسلوک اور روحانیت قرار دیتے تھے۔ اسلامی تزکیۂ نفس مولانا مودودیؒ کے نزدیک ایسے انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو فرداً فرداً اپنی گردن سے تمام اطاعتوں اور تمام بندگیوں کے حلقے اتار کر خالص اللہ کی بندگی وغلامی کا حلقہ کسی مجبوری کے بغیر آپ اپنی ہی رضا ورغبت سے پہن لیں، اور پھر اللہ کی اطاعت وخدمت اس نوکر کی طرح انتہائی وفاداری اور خوف وخشیت اور حسنِ کارگردگی کے ساتھ کریں جو اپنے آقا کو سامنے کھڑا دیکھ کر، یا یہ محسوس کر کے کہ آقا کی نگاہ اس پر ہے، زیادہ سے زیادہ بہتر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے کہ اس کی کوئی بات آقا کے غضب کی موجب نہ ہو۔ پھر اس قسم کے افراد جوڑ کر اسلام ایک ایسا منظم گروہ وجود میں لانا چاہتا ہے جو دنیا کو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھے، جس کی ساری جدّ و جہد اور سعی وعمل صرف اس لئے ہو کہ دنیا سے فساد، جو اللہ کو مبغوض ہے، مٹ جائے اور خیر و صلاح، جو اللہ کو محبوب ہے، اس کی جگہ قائم ہو، جو خیر کا علَم ہاتھ میں لے کر دنیا بھر سے اس کے لیے لڑ جانے پر تیار ہو اور سارے جہاں سے اس کی کشمکش اور نزاع صرف اسی ایک بات پر ہو کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اس کے آگے سارے کلمے دب کر رہ جائیں [۲۱]

سورہ مزمل کی آیت: ۶ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (درحقیقت رات کا وقت انسانی نفس پر قابو رکھنے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے) کی تفسیر کرتے وقت مولانا مودودیؒ تزکیہ کی معاشرتی اور اجتماعی جہات پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اَشَدُّ وَطْئًا کا ایک مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چوں کہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے، اس لیے یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دینِ حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے، کیوں کہ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا ہے اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیوں کہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا، اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چوں کہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے، اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے [۲۲]

صفاتِ مطلوبہ

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے علمِ احسان کے چار اخلاقی اصول گنائے ہیں جن کی بھرپور رعایت کے بنا کوئی شخص مقامِ احسان تک نہیں پہنچ سکتا۔ پہلا اصول 'طہارت' کا ہے جس کی روح یہ ہے کہ باطن منور اور پاکیزہ ہو اور وہ انشراح و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو۔ دوسری طرف افکارِ پریشاں اور نظریاتِ ژولیدہ سے دور اور جزع فزع اور فریاد و ماتم سے مبرا ہو۔ دوسرا اصول 'اخبات' کا ہے جو جبروت سے آشنائی پیدا کرتا ہے اور

عبادات، اذکار اور تلاوت کے ذریعہ قلب میں سوز و گداز اور فروتنی و خاکساری کا محرک بنتا ہے۔ عبادات کی روح یہ ہے کہ حضورِ قلب پیدا ہو۔ بارگاہِ خداوندی میں باریابی کا شوق کروٹیں لے، محبتِ خداوندی کے ساتھ جلالِ الٰہی کا انعکاس ہو اور قہاری و غفاری دونوں صفاتِ ملکوتی کا پرتو اس میں نظر آئے۔ تیسرے اصول 'ساحت' کا تقاضا ہے کہ ملکوتی صفات حیوانی محرکات اور بہیمی جذبوں کے تابع نہ ہوں۔ ساحت کے دائرے میں زہد و قناعت، جود و سخا، تواضع و فروتنی، امیدوں کی محدودیت، صبر اور لینت و نرم خوئی کی مطلوبہ صفات داخل ہیں۔ چوتھا اصول 'عدالت' ہے۔ اس میں عدلِ اجتماعی، تدبیرِ منزل، سیاستِ ملکی اور اصلاحی امور داخل ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کی صفاتِ اربعہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں انفرادی سیرت کی تعمیر پر زیادہ زور ہے، اگرچہ 'عدالت' کے اصول میں فاضل مصنف نے اجتماع و معاشرت کے تقاضوں سے صرف نظر نہ کر کے اس کمی کی کسی حد تک تلافی کی ہے، مگر بحیثیتِ مجموعی وہ انفرادی اوصاف و کمالات کو احسان کی اصل جولان گاہ اور مرکز قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مولانا مودودیؒ کے رجحانات پر اجتماعی تقاضوں کی گہری چھاپ ہے۔ تزکیہ کا تصور ان کے یہاں اسلامی اجتماعیت سے ہم آہنگ اور اسلام کے عمرانی و سماجی فرائض کی تکمیل کی طرف پیش رفت کرنے میں زیادہ معاون و مددگار ہے۔

اسلامی تزکیۂ نفس کے لیے مولانا مودودیؒ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ اجتماعی اوصاف میں محبتِ باہمی، مشاورت، نظم و ضبط اور اسلامی تنقید و محاسبہ کو وہ سرِ فہرست رکھتے ہیں۔ انفرادی اوصاف میں اسلام کا صحیح فہم، پختہ ایمان اور قول و عمل میں مطابقت اور اقامتِ دین کو مقصدِ زندگی بنالینا وہ بنیادی خصوصیات ہیں جو فرداً فرداً ہر شخص میں مطلوب ہیں، مگر اس کے ساتھ چند مزید اوصاف ہیں جن کی موجودگی اصلاح و تعمیر میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے: تعلق باللہ اور اخلاص للہ، فکرِ آخرت، حسنِ سیرت، صبر، حکمت، تفقہ فی الدین اور بصیرت۔ ان انفرادی اوصاف کی مولانا مودودی نے جو تشریح کی ہے وہ اسلامی ادبیات میں بے بہا اضافہ اور اسلام کی عمرانی و

اجتماعی پہلوؤں کی بے نظیر تفہیم ہے۔ مثال کے طور پر صبر کی تفسیر میں مولانا نے اس کے تمام معنوی پہلوؤں کو جمع کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ آدمی جلد باز نہ ہو، اپنی کوششوں کے نتائج فوراً اور جلدی دیکھنے کے لئے بیتاب نہ ہو اور دیر لگتے دیکھ کر ہمت نہ ہار جائے۔ صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آدمی متلون اور ضعف رائے اور قلتِ عزم کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ صبر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آدمی مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور اپنے مقصد کی راہ میں جو تکلیف پیش آجائے اسے ٹھنڈے دل کے ساتھ برداشت کرے۔ صبر کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی زُود رنج اور مشتعل مزاج نہ ہو، بلکہ متحمل اور بردبار ہو۔ صبر اس چیز کا بھی نام ہے کہ آدمی ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر جما رہے۔ صبر ان تمام معنوں میں کلیدِ کامیابی ہے''۔[۲۳]

اسی طرح حکمت کی تشریح میں مولانا مودودیؒ نے گہری بصیرت و تدبر، دانش مندی و معاملہ فہمی، موقع شناسی و تدبیرِ امور اور دانائی و زیرکی کے تمام مظاہر کو شامل کر لیا ہے:

''یہ حکمت ہے کہ آدمی انسانی نفسیات کی سمجھ رکھتا ہو اور انسانوں سے معاملہ کرنا جانتا ہو۔ یہ بھی حکمت ہے کہ آدمی اپنے تمام کام کو اور اس کے کرنے کے طریقوں کو جانتا ہو اور اس کے راستے میں پیش آنے والی دشواریوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں سے نمٹنا بھی اس کو آتا ہو۔ حالات کو سمجھے بغیر اندھا دھند قدم اٹھا دینا، بے موقع کام کرنا اور موقع پر چوک جانا مغفل لوگوں کا کام ہے اور حکمت کے سراسر خلاف ہے''۔[۲۴]

اس مختصر جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے افکار و نظریات اور اصلاحی و تعمیری اسکیم میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسلام کی معاشرتی و عمرانی تشریح کے میدان میں مولانا مودودیؒ نے جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے اس میں وہ بڑی حد تک شاہ ولی اللہؒ سے خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں، البتہ بعض پہلوؤں سے ان کا کارنامہ امتیازی نوعیت کا

ہے۔ انہوں نے تصوف کے غیر اسلامی افکار و اعمال کے معاملے میں غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا اور مروّجہ تصوف کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ قرار دے کر قرآنی تزکیہ اور حدیثی احسان کے مضمرات سے آگاہ کیا، جب کہ شاہ صاحب نے شریعت و طریقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے وحدت الوجود کے نظریہ کو تسلیم بھی کیا اور اس کی نئی تعبیر و تشریح بھی کی اور خود بسا اوقات تصوف کے اعمال و اشغال میں مصروف بھی نظر آئے۔

شاہ صاحب کا زیادہ زور انفرادی سیرت کی تعمیر پر ہے۔ وہ اگرچہ حجۃ اللہ البالغہ اور بعض دوسری کتابوں میں اسلام کے معاشرتی تقاضوں کی تکمیل کو نظر انداز نہیں کرتے، مگر بحیثیت مجموعی انفرادی تزکیہ کے علم بردار ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے قرآن کے تزکیہ کو اس کی عمرانی تعلیمات سے ہم آہنگ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں اجتماعی و معاشرتی تقاضے 'احسان' و تصوف کے معانی میں شامل ہیں اور غالباً اس میں ان جدید حالات و عوامل اور تحریکی و انقلابی نظریات کا بھی دخل ہے جن کے جلو میں مولانا مودودیؒ نے اسلام کی تعبیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔

☆☆☆

حواشی و تعلیقات

۱ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، القول الجمیل فی بیان سواء السبیل، شاہ ولی اللہ اکیڈمی لاہور، ص ۱۵۷

۲ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، نفس مصدر ص ۲۶

۳ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور، جلد اوّل ۱۹۸۷ء ص ۳۳۲) نے متحدہ قومیت کے مسئلہ پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نظریات کا قرآن و سنت اور عقلی دلائل کی روشنی میں محاکمہ کرتے ہوئے اس آیت سے یہ اصول اخذ کیا ہے جو مولانا کی خداداد ذہانت کی دلیل ہے۔

۴ چناں چہ پاکستان کے وزیر اعظم مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے جب ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ دیا تو علماء نے اسے بالکلیہ مسترد کر دیا اسی طرح شام میں اخوان المسلمون کے رہنما اور مفکر شیخ مصطفیٰ السباعی کی کتاب 'اشتراکیۃ الاسلام' طبع ہوئی تو عالم عرب میں بالعموم اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، حالانکہ ترجمانی بڑی حد تک صحیح تھی، مگر اصطلاح اجنبی تھی، جس سے مرعوبیت جھلکتی تھی۔ یہی حال مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کا ہے جس میں اشتمالیت سے اسلام کے معاشی نظام کی مشابہت دکھائی گئی ہے۔

۵ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، التفہیمات الالٰھیۃ، مجلس علمی ڈابھیل، سورت، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء ، جلد اول ص ۲۱۴ - ۲۱۵

۶ عاصم نعمانی، تصوف اور تعمیر سیرت (مولانا مودودی کی تحریروں کی روشنی میں) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۵-۱۰۶

۷ امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب التفسیر، سورہ ۳۱، کتاب الایمان ۳۷

۸ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، مجموع فتاویٰ، جمع وترتیب عبدالرحمان قاسم العاصمی، مطابع الریاض، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۳۸۱-۱۳۸۲ھ، ج:۱۱ص:۶

۹ قرآن وسنت کی روشنی میں تصوف کے بے لاگ علمی اور سنجیدہ مطالعہ کے لیے دیکھئے ڈاکٹر غلام قادر لون: مطالعہ تصوف، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۹۴ء

۱۰ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حجۃ البالغہ ۲/۵۶۰-۵۶۱ (تحقیق ومراجعہ، السید سابق، دارالکتب الحدیثہ بالقاہرۃ)

۱۱ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، رسالۂ دینیات، دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۸-۱۱۹

۱۲ تصوف اور تعمیر سیرت، ص ۶۲

۱۳ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، الطاف القدس فی معارف لطائف النفس، مطبع احمدی، ص ۲۷

۱۴ حجۃ اللہ البالغہ ۲/۵۶۶-۵۶۷

۱۵ تصوف اور تعمیر سیرت، ص ۴۰

۱۶ ابو قاسم عبدالکریم القشیری، الرسائل القشیریۃ (متن مع اردو ترجمہ) مترجم ڈاکٹر محمد حسن، المعہد المرکزی للابحاث الاسلامیۃ، کراچی، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء، ص ۷۳

۱۷ حوالہ بالا ص ۶۶، شیخ سری سقطی نے تقریباً یہی بات کہی ہے۔ الطبقات الکبریٰ ۱/۷۴

۱۸ سیّد محمد بن مبارک علوی کرمانی (میر خورد) سیر الاولیاء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، مؤسسۃ انتشارات اسلامی لاہور، ۱۳۹۸/۱۹۸۷ء، ص ۵۰

۱۹ حوالہ بالا ص ۷۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر غلام قادر لون، مطالعۂ تصوف،

۲۰ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حجۃ اللہ البالغۃ ۲/۵۶۵-۵۶۶

۲۱ تصوف اور تعمیر سیرت، ص ۶۰-۶۱

۲۲ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۸ء جلد ششم، ص ۱۲۸

۲۳ تصوف اور تعمیر سیرت، ص ۹۴-۹۶

۲۴ حوالہ بالا ص ۹۴-۹۶

غیر اسلامی ریاست اور مسلمان

مولانا سید جلال الدین عمری

کسی غیر اسلامی ریاست میں مسلم اقلیت کا کیا موقف ہونا چاہئے اور اسلام نے اس سلسلے میں کیا ہدایات دی ہیں؟ یہ دورِ حاضر کا ایک اہم سوال ہے۔ اس کتاب میں اس کا مدلّل جواب فراہم کیا گیا ہے اور ان اعتراضات کا بھرپور رد کیا گیا ہے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔ دین پر استقامت، عدل کا قیام، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، انسانی حقوق کا احترام، دفاع اور انتقام کا حق اور اس کی معنویت اور مطلوبہ دینی و اخلاقی کردار جیسے عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ صفحات: ۴۸ قیمت: =/۱۵ روپے

ملنے کے پتے ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

ترجمہ وتلخیص:

فتاویٰ اور استنباطِ مسائل میں شدت پسندی کا رجحان

ڈاکٹر مسفر بن علی محمد قحطانی

ترجمہ: مفتی احمد نادر القاسمی

دورِ حاضر میں نئے پیش آمدہ مسائل اور ایجادات کے سلسلہ میں غور وفکر کے بہت سے طریقے وجود میں آئے ہیں اور ہر منہج فکر کے حامل علماء نے اپنے اجتہادات اور غور وفکر کی بنیادیں اپنے طے کردہ خطوط پر رکھی ہیں۔ فتویٰ اور اجتہاد کے یہ مناہج اِس زمانے کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ یہ روایت زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ ماضی میں بھی علماء نے اجتہاد اور استنباطِ مسائل کی بنیاد اپنے اپنے طے کردہ اصول و مناہج اور جداجدا طریقۂ استنباط پر رکھی ہے۔ یہاں میں صرف چند امور کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں، تاکہ وہ اس دور کے جدید مسائل کے حل میں معین و مددگار ثابت ہوں، نیز منہج کے تعین، دقتِ نظر اور غور وفکر کے حقیقی ادراک میں اصولی طور پر وہ رہنمائی کا بھی کام کرسکیں۔

پیش آمدہ مسائل میں غور وفکر کے لیے عصر حاضر میں جو مناہج اختیار کیے گئے ہیں ان میں سب سے اہم شدت پسندی اور حرج وتنگی کا منہج ہے۔ اس مقالہ میں شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں اسی منہج کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

اسلامی شریعت کی بنیاد:

شریعتِ اسلامیہ کی بنیاد آسانی اور بندگانِ خدا کو سہولت بہم پہونچانے اور ان سے تنگی کو حتی الامکان دوٗر کرنے پر ہے۔ اس کی بے شمار دلیلیں کتاب وسنت میں

موجود ہیں۔ ان دلائل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنایا ہے اور اس میں ان کے لیے آسانی رکھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا تھا اور آپؐ کے ذریعہ گزشتہ امتوں میں پائی جانے والی دشواریوں اور بندشوں کو دور کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ:۱۲۸)

اے لوگو! تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری ہی جنس یعنی بشر میں سے ہیں، جو چیزیں تمہیں مضرت پہنچاتی ہیں ان پر نہایت گراں گذرتی ہیں، جو تمہاری بھلائی کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (ان کی یہ حالت یوں تو سبھوں کے ساتھ ہے) بالخصوص اہل ایمان کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء:۱۰۷)

ہم نے آپ کو دنیا کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

إن اللّٰه لَمْ يبعثني معنّتاً ولا متعنّتاً ولكن بعثني معلّماً ميسّراً [۱]

اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں کو سختی میں ڈالنے والا اور سختی اور تکلیف برداشت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ معلم اور آسانی پہونچانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

خاتم النبیین ﷺ کے نمایاں اوصاف قرآن میں یہ بیان کیے گئے ہیں:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف:۱۵۷)

اور وہ ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

اسی لیے آں حضرت ﷺ بعض افعال اور احکام کو چھوڑ دیتے تھے، اس اندیشے سے کہ کہیں آپ کی امت کے لیے وہ تکلیف و زحمت کا باعث نہ بن جائیں۔ چناں چہ مسواک کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے:

لو لا أن أشقّ على أمتي لأمرتهم بالسواک "[۲]

میری امت کے لیے اگر مشقت کا باعث نہ بنتا تو میں ضرور مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

آپؐ امت کے لیے ہر موقع پر سہولت و آسانی کے خواہاں رہے۔ یہی نہیں، بلکہ آپ نے اپنے اصحاب کو بھی تیسیر و تسہیل کا معاملہ کرنے اور حرج و تنگی سے لوگوں کو حتی الامکان بچانے کا حکم فرمایا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا واقعہ حدیث میں بہت مشہور ہے کہ آپؐ نے جب ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو بطورِ خاص انہیں آسانی کی راہ اپنانے کی ہدایت کی اور فرمایا:

یسّرا ولا تعسّرا، بشّرا ولاتنفّرا "[۳]

لوگوں کو آسانی و سہولت فراہم کرنا، انہیں تنگی و دشواری میں مت ڈالنا، خوش خبری کی باتیں بتانا، نفرت انگیز باتیں مت کرنا۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ذخیرۂ احادیث میں موجود ہیں، جن میں امت اور دین کے معاملہ میں نرمی اختیار کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں اور لوگوں کے حقیقی مصالح کو نظر انداز کر کے تنگی و شدت کی راہ اپنانے سے روکا گیا ہے۔

شدت پسندی اور تنگی کے مظاہر:

عوامی مسائل میں شدت اختیار کرنا غلو فی الدین میں داخل ہے، جو مذموم ہے۔ خواہ یہ طریقہ فقہ و فتاویٰ اور اجتہاد و استنباط میں اپنایا جائے، یا تعلیم و تربیت یا دیگر امور میں، بہر حال وہ شرعاً ناپسندیدہ ہے۔ معاملہ اس وقت ہلکا ہوتا ہے جب یہ رویہ اپنی ذات کے سلسلے میں اختیار کیا جائے، لیکن اس کی نوعیت اس وقت بالکل بدل جاتی ہے جب دوسروں کو اس کا حکم دیا جانے لگا اور انہیں اس کا پابند کیا جائے۔ فتویٰ کے معاملے میں

اس منہج کے چند نمایاں مظاہر ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

الف۔ نظریاتی اور مسلکی تعصّب:

اجتہادی امور میں، مسلکی، شخصی، تقلیدی و نظریاتی عصبیت کسی شخص میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مسائلِ شرعیہ میں غور کرتے وقت وہ اپنی ہی فکر اور اجتہادی نتیجہ کو حق اور حرفِ آخر تصور کرنے لگتا اور دوسروں کی رائے کو سراسر غلط سمجھ بیٹھتا ہے، بلکہ دوسری رائے رکھنے والے پر طعن و تشنیع بھی شروع کر دیتا ہے۔ نتیجتاً یہی چیزیں امورِ شرعیہ میں شدت کی راہ کھولتی ہیں۔ اس قسم کی شدت پسندی کی مذمت کرتے ہوئے امام احمدؒ فرماتے ہیں:

من أفتى الناس ليس ينبغي له أن يجعلهم على مذهبه ويشدّد عليهم [۴]	جو شخص فتویٰ دے اس کے لیے یہ بالکل مناسب نہیں کہ لوگوں کو صرف اپنے ہی مسلک (رائے) کا پابند بنانے کی کوشش اور ماننے کے لیے ان پر جبر کرے۔

اس سلسلے میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ وہ کسی بھی مسلک کے کسی قول کو لازماً اختیار کرنے کو واجب قرار نہیں دیتے [۵] چناں چہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"کسی مسلمان کو جب کوئی معاملہ درپیش ہو تو اسے اختیار ہے کہ اپنے اس معاملہ میں اسے جس شخص پر اطمینان ہو کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ دیتا ہے، خواہ وہ کسی بھی فقہی مسلک کا پیرو ہو، اس سے فتویٰ دریافت کر لے اور اس پر عمل کرے۔ کسی مسلمان پر واجب نہیں کہ وہ علماء میں سے کسی متعین عالم کی تقلید کرے اور اس کی ہر بات کو مانے۔ اور نہ کسی مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی متعین مسلک کی پیروی کرے، سوائے جناب رسول اللہ ﷺ کے، کہ جس چیز کو آپؐ نے واجب قرار دیا ہے، یا اس کی خبر دی ہے اس کی اتباع ہر مسلمان پر لازم ہے، آپؐ کے علاوہ کوئی بھی ہو، اس کی بعض باتیں قبول کی جا سکتی ہیں اور بعض باتیں ترک کی جا سکتی ہیں"۔ [۶]

مسلکی عصبیت کس طرح فکر ونظر کا دروازہ بند کر دیتی ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں:

''مسلکی مکتبِ فکر کا پختہ اعتقاد ہے کہ کسی معین مسلک کی اتباع واجب ہے اور اس سے عدول وخروج ناجائز ہے، ضروری ہے کہ جدید مسائل میں اسی متعین مسلک کے دائرے میں غور وخوض کیا جائے اور اسی مسلک کے علماء کے اقوال کی تخریج کی جائے، خاص طور سے متاخرین کا یہی خیال ہے۔ ان لوگوں سے جب کسی نئے معاملہ میں مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے تو اسی متعین مسلک کی کتابوں میں، یا زیادہ سے زیادہ مسالکِ اربعہ کی کتابوں میں اس کی نظیر تلاش کرتے ہیں۔ اگر انہیں کوئی نظیر نہ ملے تو اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دے ڈالتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں معاملات میں اصل ممانعت ہے، سوائے ان معاملات کے جن کے جواز کا سلف نے فتویٰ دے دیا ہو''۔ ؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ ترقیات کے نتیجہ میں لوگوں کی زندگی میں مختلف نوعیتوں کی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور اس میں بہت سی پیچیدگیاں آ گئی ہیں۔ ان حالات پر نظر رکھنے والا اچھی طرح سمجھتا ہے کہ بہت سے فقہی مسائل جو مناسبت، مصلحت اور رائج عرف پر مبنی تھے، ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ جیسے آج کے بیش تر معاشی مسائل، مثلاً: بیع سلم، ضمانات (گارنٹیز) حوالات (آرڈر) وغیرہ۔ ان مسائل میں بعض فقہاء کی عبارات اور ایسی شرائط جن کی بنیاد کسی صریح نص پر ہے نہ اجماع پر، انہیں اختیار کرنا اسلام کے فراہم کردہ آسانی کے اصولوں کے خلاف ہے اور بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ لوگ ایسے مسائل سے دوچار ہوں جو لوگوں کی سخت ضرورت اور حاجتِ شدیدہ کے دائرے میں داخل ہو چکے ہوں۔ مثال کے طور پر بہت سے معاملات ہیں جو لوگوں کی ضروریات کا حصہ اور زندگی کا لازمی جزء قرار پا چکے ہیں۔ ان کے بارے میں شریعت کا اصول اباحت اور جواز کا ہے۔ ان معاملات کے ساتھ بعض ایسی صورتیں شامل ہو جاتی ہیں جو ان میں خلل پیدا کرتی ہیں اور ان معاملات کو حرمت سے قریب کر دیتی ہیں۔ ایسے معاملات میں، جو اب لوگوں کے درمیان عام ہو گئے ہیں، فقیہ حرمت کے پہلو کو

غالب کر دیتا ہے، حالاں کہ معاملات میں اصل جواز ۸ اور منافع میں اصل اباحت ہے۹۔

مذکورہ قاعدہ کی اساس دراصل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

الحلال ما أحلّ اللّٰه في كتابه، والحرام ماحرّم اللّٰه في كتابه، وما سكت عنه فهو ممّا عفا عنه ۱۰

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جن چیزوں کے بارے میں کتاب اللہ خاموش ہے یہ وہ امور ہیں جن سے اللہ نے درگذر فرمایا ہے۔

اس طرح کے اصول وکلیات کے کتاب وسنت میں موجود ہونے کے باوجود علماء کے شدت آمیز رویہ کے نتیجہ میں لوگ یا تو شاذ اور مرجوح اقوال تلاش کر کے ان پر عمل کرنے لگتے ہیں، یا پھر شریعت کی پابندی سے بالکلیہ آزاد ہو جاتے ہیں۔

اگر فقہاء اس طرح کے معاملات میں توسّع سے کام لیتے اور لوگوں کے لیے جواز کی صورتیں اور حرمت کی صورتیں الگ الگ بتادیتے، ساتھ ہی شرعی بدل بھی تجویز کرتے تو بہتر ہوتا ۱۱

مثال کے طور پر اس زمانے میں حج میں حجاج کی کثرت اور بھیڑ کی وجہ سے بہت سے مسائل اور دشواریاں پیدا ہوئیں۔ ان دشواریوں کے پیش نظر بہت سے علماء کی اجتہادی آراء میں تبدیلی ہوئی اور لوگوں کو تنگی سے بچانے کے لیے مذاہب فقہیہ کے مشہور اقوال کو ترک کر دیا گیا۔ اگر یہ علماء اپنے ائمہ کے قدیم اقوال کو ترک نہ کرتے اور حالات و ظروف کے بدلنے اور زمانوں اور معاشروں کے اختلاف کا اعتبار کیے بغیر انہی قدیم اقوال کے مطابق فتوے دیتے تو حجاج کو بہت زیادہ پریشانی ہوتی۔ جیسے ایام تشریق میں رمی جمار کا وقت جمہور ائمہ کے قول کے مطابق زوال شمس سے غروب آفتاب تک ہے، غروب آفتاب کے بعد رمی جائز نہیں ہے۔۱۲ مگر بہت سے محققین اور افتاء کمیٹیوں نے حجاج کی کثرت اور بھیڑ کے پیش نظر اور آسانی کا خیال کرتے ہوئے رات میں بھی رمی جمار کی اجازت دی ہے۱۳

ب۔صرف ظاہرِ نصوص کو اختیار کرنا:

اس میں کوئی شک نہیں کہ نصوصِ شرعیہ کی تعظیم کرنا اور ان سے استدلال کرنا دینی بنیاد اور مطلوبِ شرعی ہے۔ کسی مجتہد کے لیے قطعاً جائز نہیں کہ وہ مسائل میں غور وفکر کرتے وقت نصوصِ شرعیہ کا اہتمام نہ کرے، مگر اصل انحراف وہاں پیدا ہوتا ہے جب نصوص کی گہرائی تک پہنچے بغیر اور مقاصدِ شرع کو نظر انداز کر کے صرف ظاہرِ نصوص کو اختیار کیا جائے۔ یہ رجحان آج کل پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صالح المزید نے لکھا ہے:

''ہمارے زمانے میں بعض ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے صرف قرآن کریم، سنن ابوداؤد اور ایک ڈکشنری کافی ہے''۔[۱۴]

حقیقت یہ ہے کہ فقہ واجتہاد کے باب میں اس طرح کی سوچ ایک بچکانہ سوچ ہے اور بغیر کسی خوف کے کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کا نظریہ رکھنے والوں کو فقہ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، کجا کہ وہ اجتہاد کرنے لگیں۔ ایسے لوگوں کو فقیہِ عصر علامہ یوسف قرضاوی نے ''نئے ظاہری'' کا نام دیا ہے۔ کہتے ہیں:

''دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو صرف نصوص کے ظاہری الفاظ پر تکیہ کرتے ہیں۔ انہیں میں ''نئے ظاہری'' کہتا ہوں۔ ان میں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جو حدیث سے تو شغف رکھتے ہیں، لیکن انہیں فقہ واصول فقہ میں مہارت نہیں ہے۔ اسی طرح نہ تو علماء کے اصولِ اختلاف اور استنباطِ مسائل کے مدارج ومناہج کا انہیں علم ہے اور نہ مقاصدِ شریعت، حالات وزمانہ اور احوال وظروف کی تبدیلیوں پر مبنی احکام کی علتوں کو وہ پیش نظر رکھتے ہیں''۔[۱۵]

درحقیقت یہ لوگ کتاب وسنت کے تشفی بخش دلائل پیش کیے بغیر کسی بھی چیز کو حرام قرار دے دیتے ہیں اور عوام کی زندگی میں دقتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ، إِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (النحل:۱۱۶)

اور کسی چیز کے اپنی زبان سے جھوٹ بنالینے سے مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام کہ اللہ پر بہتان باندھو، یقینی جو لوگ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہ ہوگا۔

علماء کی اس شدت پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے ایسے جائز معاملات تھے جو حرام قرار دے دیے گئے، علم ومعرفت کے کتنے دروازے تھے جو بند کر دیے گئے اور کتنے لوگ ہیں جو ملت سے باہر کر دیے گئے، محض یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ نصوصِ قطعیہ اور ثابت شدہ دلائل کے خلاف ہیں، حالاں کہ علماء راسخین کے نزدیک معاملہ اس کے برعکس تھا۔ علامہ ابن قیمؒ نے مفتیان اور علماء کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''کسی مفتی کے لیے، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے، جائز نہیں کہ وہ کہے: فلاں چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور فلاں چیز کو حلال، فلاں چیز کو واجب کیا ہے اور فلاں کو مکروہ، جب تک کہ پورے یقین کے ساتھ یہ نہ جان لے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس چیز کی حرمت، حلّت، اباحت اور کراہت سے متعلق کیا فرمایا ہے۔ اسلاف کے یہاں بھی یہ بات عام طور سے ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: کسی کے لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ فلاں چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور فلاں کو حلال، جب تک کہ اسے قطعی طور پر اس کا علم نہ ہو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: تو جھوٹ بولتا ہے، میں نے تو اسے حلال اور اسے حرام قرار نہیں دیا ہے''[۱۶]

پیش آنے والے واقعات کے بارے میں علم راسخ کے بغیر حرمت کا حکم لگانے سے، ظاہر ہے کہ لوگ دشواریوں اور تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں، جو اسلامی شریعت کے توسّع اور مخلوق پر رحم وکرم کے خلاف ہے۔

ماضی قریب میں ایسے بھی واقعات پیش آئے کہ بعض لوگوں نے بغیر سوچے سمجھے مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی اور حکومت کی تکفیر کر ڈالی، یہاں تک کہ محض ارتکابِ

معاصی کو خارج از اسلام ہونے کا سبب قرار دے دیا۔ ان میں سے بعض لوگ تو یہاں تک کہہ گئے کہ لفظ ''عاصی'' لفظ ''کافر'' کے ہم معنی اور اس کے مساوی ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص کو ایک ہی وقت میں مسلمان بھی کہا جائے اور کافر بھی۔ ۱۷

یہ صورتِ حال، جو دلائل پر تدبر کے بغیر محض ظاہرِ نصوص پر انحصار کی وجہ سے پیدا ہوئی، امت کے لیے تنگی و پریشانی کا باعث بنی۔ شاید یہ خوارج کا تسلسل ہے جنہوں نے خود کو بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی تنگی اور پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یا ظاہر یہ کا تسلسل ہے جنہوں نے شذوذ کی راہ اختیار کرتے ہوئے بعض عجیب وغریب آراء اختیار کر لی تھیں۔

ج۔ سدِّ ذرائع میں غلو اور اختلافِ آراء کے وقت احتیاط پسندی میں مبالغہ:

سدِّ ذرائع کی اہمیت و اعتبار، نیز مقاصدِ شرع کے پیشِ نظر بندگانِ خدا سے مفاسد کے دفعیہ اور منافع کے حصول کے لیے بطورِ دلیل واصل اس کے اختیار کیے جانے پر بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے کتنی اچھی بات کہی ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام کیا ہے اور کچھ چیزیں اس تک پہنچانے والی ہیں تو وہ ان چیزوں کو بھی حرام کر دیتا ہے اور ان سے روک دیتا ہے، تاکہ اس چیز کی حرمت پختہ طور پر ثابت ہو جائے اور کوئی اس کے قریب بھی نہ پھٹکے۔ اگر اس نے حرام تک پہنچانے والے وسائل و ذرائع کو جائز رکھا ہوتا تو یہ تحریم سے متناقض ہوتا اور لوگوں کے دل اس حرام کی جانب مائل ہوتے'' ۱۸

سدِّ ذرائع کے قاعدہ کو اختیار کرنے پر اشکال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں غلو کیا جائے اور یہ غلو اس حد تک بڑھ جائے کہ وہ امور، جن میں واقعی بندوں کے راجح مصالح ہیں، ان کو محض ظنّی اور وہمی مفسدہ کے پیشِ نظر ترک کیا جائے اور اس طرح غیر شعوری طور پر جواز کا دروازہ بند کر کے شریعت کے بارے میں بدگمانی پیدا کر دی جائے۔ جیسے انگور کی کاشت کو محض اس لیے حرام قرار دیا جائے کہ لوگ اس سے شراب بنائیں گے، یا قریب قریب گھر بنانے سے اس لئے منع کیا جائے کہ اس سے زنا کا اندیشہ

ہے۔ جمہورِ امت کے نزدیک ایسی چیزوں سے نہیں روکا جائے گا۔ اس لیے کہ ان کی مصلحت راجح ہے، اس لیے انہیں موہوم اور مرجوح مفاسد کی بنا پر ترک نہیں کیا جائے گا۔ ۱۹

عصر حاضر کے بعض نام نہاد فقہاء دوسری اقوام کی تیار کردہ اشیاء، علوم و معارف اور نئی ایجادات کے اخذ و استفادہ سے منع کرتے ہیں۔ اسے وہ دین میں بدعت اور سید المرسلین ﷺ کے طریقے کی مخالفت قرار دیتے ہیں ۲۰

موجودہ عہد میں اقتصادیات اور طب کے میدان میں جو ایجادات ہوئی ہیں ان میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیش تر غیر مسلم ممالک میں ہوئی ہیں۔ اگر محض اس بنا پر ان اشیاء کے استعمال کی ممانعت کا حکم لگا دیا جائے کہ وہ غیر مسلم ملکوں کی تیار کردہ ہیں تو یہ لوگوں کے لیے حرج و تنگی کا باعث ہوگا، اس لیے کہ لوگ ہمیشہ دوسری اقوام کے ساتھ تہذیبی و تمدنی اختلاط کی وجہ سے ایک دوسرے کی ایجادات سے استفادہ کرتے آئے ہیں۔ اگر بغیر کسی دلیل کے لوگوں پر ممانعت کا حکم لگا دیا جائے تو لوگ دین سے دور ہو جائیں گے اور حلت و حرمت کا حکم جانے بغیر ان چیزوں کو اختیار کر لیں گے۔ اس لیے اہم چیز یہ ہے کہ صرف ایسے ''وسائل و ذرائع'' سے روکا جائے جو لوگوں کو مفاسد راجحہ کی طرف لے جانے والے ہوں، اگرچہ وہ فی نفسہ مباح ہوں، اور ایسے ''ذرائع'' اختیار کرنے کی اجازت دی جائے جو تقربِ الٰہی اور نیکی کے کاموں کی طرف لے جانے والے ہوں اور ان کی مصلحت کا پہلو راجح ہو۔ ۲۱

اختلافی مسائل میں بے جا احتیاط:

نئی چیزوں کے بارے میں فتویٰ دیتے وقت تنگی اور شدت پسندی کا ایک مظہر یہ ہے کہ ہر اختلافی مسئلہ میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے حرام یا وجوب کا فتویٰ دیا جائے، تاکہ مکلّف کے لیے احکام پر عمل میں تساہل کا دروازہ بند کر دیا جائے، یا اسے کسی شبہ میں پڑنے سے روک دیا جائے اور اس حکم کا اطلاق تمام لوگوں پر اور تمام احوال و ظروف پر ہو، جیسے خواتین کو شرعی ضوابط اور حاجتِ شدیدہ کے باوجود سدِّ ذریعہ کی بنا پر ملازمت کی

اجازت نہ دینا ۲۲ اور فوٹوگرافی اور ٹیلی ویژن کی تصاویر کو موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کے باوجود ناجائز قرار دینا وغیرہ ۲۳ ان چیزوں کی اجازت موجودہ دور کے جمہور علماء نے خاص شرائط کے ساتھ دی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ احتیاط پر عمل تقویٰ اور اطمینانِ قلب کے پیشِ نظر ذاتی طور پر انسان کر سکتا ہے۔ جہاں تک عام لوگوں کو اس کا مکلف بنانے اور فتویٰ کے لیے احتیاط کو بنیاد بنانے کا تعلق ہے تو یہ لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرنے کا باعث ہے۔ ۲۴

فقہ میں ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے: استحباب الخروج من الخلاف ۲۵ یعنی اختلافی مسائل میں اختلاف سے بچنا بہتر ہے، تو یہ قاعدہ بھی مطلق نہیں ہے، بلکہ علماء نے کچھ شرطوں کے ساتھ اس پر عمل مستحب قرار دیا ہے، مثلاً:

الف: اس سے کسی ثابت شدہ حکمِ شرعی کی مخالفت، یا کسی مکروہ کا ارتکاب، یا کسی مقررہ قاعدہ شرعیہ کا ترک لازم نہ آئے۔

ب: مخالف کی دلیل کا ضعف اور نقص معلوم نہ ہو۔ اگر ضعف واضح ہو تو اس صورت میں اختلاف قابلِ توجہ نہیں۔

ج: یہ عمل کسی دوسرے اختلاف کی طرف لے جانے والا نہ ہو۔

د: اس قاعدہ پر عمل کرنے والا مجتہد نہ ہو۔ اگر وہ مجتہد ہو تو جن مسائل میں اسے اجتہاد کی صلاحیت ہے، ان میں اس کے لیے احتیاط پر عمل جائز نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے مناسب ہوگا کہ دلائل و براہین کی روشنی میں اس کے نزدیک جو حکم راجح ہو اس پر فتویٰ دے۔ ۲۶

اختلاف کے موقع پر احتیاط پر عمل کرنے کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کے بارے میں ڈاکٹر باحسین لکھتے ہیں:

''رفعِ حرج کے اس قاعدہ میں اشکال یہ ہے کہ اگر حکمِ شرعی میں شک اور احتمال کے وقت احتیاط کو ضروری سمجھا جائے تو ایسے مسائل کی مقدار بہت بڑھ جائے گی جن کے

کرنے اوران سے بچنے میں احتیاط کوملحوظ رکھنا ہوگا، اور یہ چیز تخفیف وتیسیر اور رفع حرج کے منافی ہوگی۔ بلکہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر مکلف ان تمام امور میں، جن کے سلسلے میں قطعی دلائل نہیں ہوتے، ایک دن بھی احتیاط پر عمل کرنے لگے تو وہ سخت پریشانی محسوس کرے گا، پھر اگر وہ پوری زندگی اسی طرح گزارنے لگے تو کتنی پریشانی میں مبتلا ہوجائے گا، اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مکلفین میں عورتیں اور گاؤں اور دیہات کے رہنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے نظامِ زندگی میں خلل واقع ہوجائے گا اوران کے رہن سہن کے معاملات میں ضرر لاحق ہوگا"۔ ۲۷

حواشی ومراجع

۱ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب بیان أن تخییر امرأته لا یکون طلاقاً الا بنیة، حدیث نمبر ۱۴۷۸

۲ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب السواک یوم الجمعة، صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب السواک، حدیث نمبر ۱۷۳۲

۳ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب مایکره من التنازع والاختلاف فی الحرب وعقوبة من عصی إمامه، صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الأمر بالتیسیر وترک التنفیر، حدیث نمبر ۱۷۳۲

۴ الآداب الشرعیة لابن مفلح، ۲/۴۵

۵ ملاحظہ کیجیے المجموع، ۱/۹۰-۹۱، شرح المحلی علی جمع الجوامع، ۲/۳۹۳، شرح تنقیح الفصول، ص: ۴۳۲، المسودة، ص: ۴۶۵، شرح الکوکب المنیر، ۴/۵۷۴، الوصول الی علم الأصول، ابن برهان، ۲/۳۶۹

۶ مجموع فتاوی ابن تیمیه، ۲۰/۲۰۸-۲۰۹

۷ الاجتهاد المعاصر بین الانضباط والا نفراط، ص: ۸۸، الاجتهادفی الاسلام، ڈاکٹر یوسف القرضاوی ص: ۱۷۵

۸ ملاحظہ کیجیے تهذیب الفروق، ۴/۱۲۰، الفتاوی الکبریٰ، ابن تیمیه، ۴/۵۸۱

۹ ملاحظہ کیجیے البحر المحیط، ۱/۲۱۵، القواعد للحصنی ، ۱/۴۷۸، الابہاج، ۳/۱۷۷ ، نہایۃ السؤل، ۴/۳۵۲، الأشباہ والنظائر للسیوطی، ص:۱۳۳

۱۰ سنن الترمذی ، کتاب اللباس ، باب ماجاء فی لبس الفراء ، سنن ابن ماجہ ، کتاب الأطعمۃ،باب أکل الجبن والسمن

۱۱ ملاحظہ کیجیے الفکر السامی، ۱/۲۱۵

۱۲ ملاحظہ کیجیے الکافی لابن عبد البر، ۱/۳۵۵، مغنی المحتاج للشربینی ، ۲/۳۷۷،المبدع لابن مفلح، ۳/۲۵۰ ،الاقناع للحجاوی ، ۱/۳۹۰

۱۳ ملاحظہ کیجیے بدائع الصنائع ، ۲/۱۳۷ ، الشرح الممتّع علی زاد المستقنع لابن عثیمین، ۷/۳۸۵، فتاوی الحج والعمرۃ و الزیارۃ ، جمع محمد المسند،ص:۱۱۰

۱۴ فقہ الأئمۃ الأربعۃ بین الزاھدین فیہ والمتعصبین لہ،ص:۶۶

۱۵ الاجتہاد المعاصر، ص:۸۸

۱۶ إعلام الموقعین، ۴/۱۳۴

۱۷ بحوالہ الغلو فی الدین ، ڈاکٹر عبد الرحمن اللویحق ،ص:۲۷۳

۱۸ إعلام الموقعین، ۳/۱۰۹

۱۹ ملاحظہ کیجیے شرح تنقیح الفصول للقرافی، ص:۴۴۸-۴۴۹، الفروق للقرافی ،۲/۳۳، مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ ، ڈاکٹر الیوبی ، ص:۵۷۴-۵۸۴

۲۰ ملاحظہ کیجیے السیاسۃ الشرعیۃ فی ضوء نصوص الشریعۃ ومقاصدھا ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ص:۲۳۱

۲۱ ملاحظہ کیجیے شرح تنقیح الفصول، ص:۴۴۹، اعلام الموقعین، ۳/۱۰۹

۲۲ ملاحظہ کیجیے مرکز المرأۃ فی الحیاۃ الاسلامیۃ،ڈاکٹر قرضاوی، ص:۱۳۰ -۱۵۰ ، المرأۃ ما ذا بعد السقوط ؟ بدریہ العزاز، ص:۱۹۹-۲۱۶

۲۳ ملاحظہ کیجیے الاجتہاد المعاصر ،قرضاوی، ص:۸۸

۲۴ ملاحظہ کیجیے الموافقات ، ۱/۱۸۴-۱۹۴ ، العمل بالاحتیاط فی الفقہ

الاسلامی،منیب محمود شاکر، ص:۱۱۸

۲۵ ملاحظہ کیجیے الأشباہ والنظائر للسیوطی، ص:۲۵۷،الفروق للقرافی،۲۱۰/۴

۲۶ ملاحظہ کیجیے الأشباہ والنظائر للسیوطی، ص:۲۵۸،العمل بالاحتیاط فی الفقہ الاسلامی، ص:۲۵۴–۲۵۷، رفع الحرج ، ڈاکٹر صالح بن حمید، ص:۳۳۷–۳۴۸، رفع الحرج ،ڈاکٹر یعقوب الباحسین، ص: ۱۱۵–۱۳۰

۲۷ رفع الحرج ،ص:۱۱۵–۱۱۶

شیئر بازار میں سرمایہ کاری

موجودہ طریقہ کار اور اسلامی نقطۂ نظر

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی

عصرِ حاضر میں شیئر ز بازار اور اس میں سرمایہ کاری کا موضوع کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ جہاں لوگوں میں اپنی بچت کے ذریعے نفع کمانے کے لیے تجارتی شیئر ز خریدنے کا رجحان بڑھا ہے۔ وہیں دین دار طبقہ میں اس سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر جاننے کی خواہش بھی ابھری ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں شیئر ز کی ماہیت اور شیئر ز بازار کا عمل سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے اساسی طرزِ عمل کا تجزیہ کیا ہے اور اسٹاک ایکسچینج، بانڈ، فکسڈ ڈپازٹ، میوچول فنڈ اور دیگر متعلقہ اصطلاحات کی تفہیم کرائی ہے۔ نیز شیئر ز میں سرمایہ کاری سے متعلق علماء اور مفتیانِ کرام کی آراء وفتاویٰ نقل کرتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کمپنیوں کے شیئر ز پر زکوٰۃ کی ادائیگی کے طریقے سے بھی بحث کی ہے۔

اس کتاب میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اسلامی نقطۂ نظر سے بہت متوازن بحث کی گئی ہے۔

آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات:۱۵۶ قیمت پیپر بیک=/۴۵ روپے مجلد=/۶۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر:۹۳، علی گڑھ ۔۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

تعارف وتبصرہ

فرہنگِ سیرت　　سید فضل الرحمٰن

زوّار پبلی کیشنز، ناظم آباد، کراچی، سنۂ اشاعت: ۲۰۰۳ء، قیمت: درج نہیں

سیرتِ نبوی میں تحریری سرمایہ کی وسعت، تنوع اور معیار کے اعتبار سے اردو زبان دیگر زبانوں کے مقابلے میں کسی طرح فروتر نہیں ہے، بلکہ اس کی ثروت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس زبان میں جہاں روایتی موضوعات پر لاتعداد اور بیش بہا کتابیں لکھی گئی ہیں، وہیں نئے اسالیب اور نئے عناوین پر بھی مسلسل کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے۔

مؤلفِ کتاب حافظ سید فضل الرحمٰن کو سیرتِ نبوی سے خصوصی شغف ہے۔ انھوں نے سیرت پر ایک جامع کتاب ''ہادیٔ اعظم ﷺ'' تصنیف کی ہے۔ کئی سال سے ایک ششماہی مجلّہ ''السیرۃ عالمی'' نکال رہے ہیں۔ (حال میں اس کا گیارہواں شمارہ منظرِ عام پر آیا ہے) اس میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے معیاری علمی و تحقیقی مقالات شائع ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر فرہنگ میں آں حضرت ﷺ کی ازواج و اولاد، غلام، گھوڑے، ہتھیار، غزوات و سرایا، وفود، قبائل اور ان کے شعوب و بطون، پہاڑ، دریا، وادیاں، گھاٹیاں، راستے، کنویں، چشمے، تالاب، قلعے، بت، ناپ تول کے پیمانے، عرب کے بازار اور دیگر اعلام و اماکن کے بارے میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایسے تقریباً تین ہزار الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب میں تیس نقشے دیے گئے ہیں جو غزوات و سرایا، قبائل، وفود، اماکن، مشہور بازاروں، قریش کے تجارتی اسفار،

حدودِ میقات، مسجدِ نبوی اور عمرۃ الحدیبیہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔

یہ کتاب سیرت کے موضوع پر ایک بیش بہا علمی خزانہ ہے جس سے شائقینِ سیرت حسبِ توفیق استفادہ کریں گے۔ کتاب کی پیش کش بہتر بنانے کے لئے چند امور کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

فاضل مصنف نے تمام الفاظ پر اعراب لگائے ہیں، تاکہ صحیح تلفظ کے ساتھ ان کی ادائیگی ہو سکے۔ بہت سے الفاظ پر صحیح اعراب نہیں لگ سکے ہیں۔ مثلاً (قوسین میں صحیح اعراب لگایا گیا ہے) خِزْرَج (خَزْرَج) فُجَار (فِجَار) سَمَر (سَمُر) سراقة بن مالک بن جُعْثُم (جُعْشُم) شُرْجِيل (شُرَحْبِيل) صَفِيَة (صَفِيَّة) ضِحَاک (ضَحَّاک) جَدْعَان (جُدْعَان) عَقَبَة بن ابی معیط (عُقْبَة) مَكَاتِب (مُكَاتَب) طِبْرِی (طَبَرِی) بِئْرُحاء (بَيْرُحَاء)

بہت سے اماکن کے تذکرے میں ان کی مسافت قدیم پیمانوں (مرحلہ، برید، منزل، فرسخ، دن، رات وغیرہ) سے بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ذات السلاسل، سویداء، عسفان، فدک، قرقرة الکدر، مدینہ، رهاط، دومة الجندل، رقاع، روحاء، یلملم وغیرہ۔ ان کی مسافت کا، جدید پیمانوں سے بھی تذکرہ مناسب تھا۔

اس فرہنگ میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا سیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ مثلاً اہرمن، زرتشت، سدھارتھ، برہمن، مزدک، شودر وغیرہ۔ انھیں اس فرہنگ میں شامل نہ کرنا ہی اولیٰ تھا۔

کتاب کے متعدد بیانات صحیح نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ضماد بن ثعلبہ اور ضماد ازدوی (ازدی) کو الگ الگ شخصیت دکھایا ہے (ص ۱۷۷) حالاں کہ دونوں ایک ہی ہیں (ملاحظہ کیجیے اسد الغابۃ، ابن الاثیر، دار الشعب، ۵۶/۳) عبد اللہ بن جدعان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے چچا زاد بھائی تھے (ص ۱۹۲) یہ غلطی بہت سے سیرت نگاروں سے ہوئی ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے ان

کا سلسلۂ نسب بیان کرتے ہوئے صراحت سے لکھا ہے کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کے والد کے چچازاد بھائی تھے۔ و ھو ابن عم والد أبی بکر الصدیق (البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث، مصر، ۲۰۲/۲) سقیفہ بنی ساعدۃ کے ضمن میں درج ہے کہ ''حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، پھر تمام انصار نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی'' (ص ۱۵۲) حالاں کہ مؤرخین و اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت سعدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی اور شام چلے گئے تھے، وہیں ۱۴ھ یا ۱۵ھ میں ان کا انتقال ہوا (ملاحظہ کیجیے اسد الغابۃ، ۳۵۷/۲) حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں لکھا ہے: ''مشہور صحابی اور آپؐ کے غلام'' (ص ۱۵۴) حضرت سلمانؓ ایک یہودی کے غلام تھے، جس سے مکاتبت کے ذریعے گلوخلاصی میں آں حضرت ﷺ نے مدد فرمائی تھی۔ مسجدِ ضرار کے بارے میں مذکور ہے: ''ایک مسجد جو مدینے کے یہودیوں نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے تعمیر کی تھی'' (ص ۲۷۲) اس کی تعمیر یہودیوں نے نہیں، منافقوں نے کی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ کے تذکرے میں ہے: ''حدیث میں سنن کی طرز پر سب سے پہلی تصنیف کتاب الآثار کے مؤلف ہیں'' (ص ۱۰۸) اس نام سے امام ابوحنیفہؒ کی کوئی کتاب نہیں، ان کے شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی تالیفات ہیں۔

فاضل مؤلف نے اس کتاب کے ذریعے ایک علمی خدمت انجام دی ہے۔ امید ہے، موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے علمی حلقوں میں قبولِ عام حاصل ہوگا۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

روایت و درایتِ حدیث-ایک تجزیاتی مطالعہ ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی

ناشر: دارالکتاب دیوبند، سہارن پور (یوپی) سنۂ اشاعت ۲۰۰۴، صفحات ۲۵۵، قیمت -/۱۵۰ (مجلد -/۲۰۰ روپے)

رسولِ کریم ﷺ کے وصال کے کچھ ہی عرصہ بعد جہاں ایک طرف مفسدین اور فتنہ پردازوں نے جھوٹی روایتیں گھڑنا اور انہیں عام کرنا شروع کر دیا تھا، وہیں دوسری طرف محدثین، فقہاء اور علماء امت نے اس فتنہ کا قلع قمع کیا۔ انھوں

نے احادیث کی سند اور متن دونوں پہلوؤں سے تحقیق کی۔ راویوں کے حالاتِ زندگی جمع کیے اور ان کی جرح و تعدیل کی۔ متنِ احادیث کی بھی نقد و تحقیق کی اور درایت کے اصول وضع کیے۔ اس طرح صحیح اور موضوع احادیث کو چھانٹ کر الگ الگ کر دیا۔

روایت و درایتِ حدیث کی تحقیق و نقد کے جائزہ پر مختلف زبانوں میں خاطر خواہ کام ہوا ہے۔ اردو زبان میں مرحوم مولانا محمد تقی امینی کی کتاب 'حدیث کا درایتی معیار' اس موضوع پر اہمیت اور شہرت کی حامل ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ایک تحقیقی مطالعہ ہے، جس پر فاضل مصنف کو شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کا عنوان ہے: ''حدیث عہدِ نبوی اور صحابہ میں'' اس میں حدیث و سنت کے لغوی و اصطلاحی معنٰی کی وضاحت کے ساتھ عہدِ نبوی میں کتابتِ حدیث اور عہدِ صحابہ بالخصوص عہدِ خلفائے راشدین میں حدیث کی روایت اور کتابت کی صورتِ حال واضح کی گئی ہے۔ باب دوم میں فتنۂ وضع حدیث کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے اور احادیث وضع کرنے والے مختلف گروہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس فتنہ کے انسداد اور سرکوبی کے لئے محدثین نے جو خدمات انجام دی ہیں، باب سوم میں ان کا بیان ہے اور اس اعتبار سے احادیث کی مختلف قسموں اور جرح و تعدیل کے مختلف صیغوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ باب چہارم میں فاضل مصنف نے بیان کیا ہے کہ محدثین نے اگرچہ احادیث کی سند اور متن دونوں کی تحقیق کی ہے، لیکن ان کی خدمات کا اصل میدان راویوں کی تحقیق ہے، اس لیے جن احادیث کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے ان کے متون کا بھی صحیح ہونا ضروری نہیں۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے جتنی سختی عقائد اور احکام سے تعلق رکھنے والی احادیث کے نقد و تحقیق میں برتی ہے، اتنی سختی دیگر احادیث کے سلسلے میں نہیں برتی ہے، بلکہ ان کے سلسلے میں

قدرے تسامح اور اغماض سے کام لیا ہے۔ پانچواں باب ''درایتِ حدیث'' کے لیے وقف ہے۔ اس میں درایت کے لغوی و اصطلاحی معانی، غرض و غایت اور بنیادوں کی وضاحت کے ساتھ محدثین اور فقہاء کے اصولِ درایت تحریر کیے گئے ہیں۔ باب ششم میں مصنف نے تفصیل سے وہ اصول ذکر کیے ہیں جن کے ذریعے موضوع روایات کو پہچانا جا سکتا ہے اور باب ہفتم میں ان موضوعات کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔

فاضل مصنف نے موضوع سے متعلق تمام دستیاب مراجع سے استفادہ کرتے ہوئے کتاب بہت محنت سے لکھی ہے۔ وہ یہ واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں کہ محدثینِ کرام نے احادیث کی صرف اسناد کی تحقیق ہی نہیں کی ہے، بلکہ درایت کے اصول بھی وضع کیے ہیں اس طرح انھوں نے موضوع احادیث کو چھانٹ کر الگ کر دیا ہے۔

کہیں کہیں عربی عبارتوں کو صحیح نقل نہیں کیا جا سکا ہے، یا ان کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکی ہے۔ ایک جگہ مصطفیٰ سباعی کی کتاب **السنة و مکانتها فی التشریع الاسلامی** کے حوالے سے اہلِ عراق کے بارے میں امام زہریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''ہماری طرف سے اگر کوئی حدیث بالشت برابر ہوتی ہے تو وہ ان کے پاس جا کر ہاتھ بھر کی ہو جاتی ہے (ص ۸۲) اس کا متن یہ درج ہے ''**یخرج الینا شبراً فیرجع الینا ذراعاً**'' جب کہ صحیح عبارت یہ ہے: **یخرج الحدیث من عندنا شبراً فیرجع الینا من العراق ذراعاً**'' ایک جگہ صحیفۂ علی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کے شاگرد نے اس کے مشتملات دریافت کیے تو انھوں نے فرمایا: ''**العقل و فکاک الأسیر و لایقتل مسلم بکافر**''۔ اس کے اردو ترجمہ میں بھی عقل ہی لکھا گیا ہے (ص ۵۲) حالاں کہ اس روایت میں عقل دیت کے معنی میں ہے (فتح الباری، ۱/۲۰۵) اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہی روایت ابنِ ماجہ میں بھی مروی ہے۔ اس میں عقل کے بجائے لفظ ''دیات'' ہے (سنن ابنِ ماجہ،

ابواب الدیات، باب لایقتل مسلم بکافر) کئی جگہ اختلط کا ترجمہ ''مختلط ہو گئے تھے'' کیا ہے (ص ۱۴۸) جب کہ اس کا عام فہم ترجمہ یہ ہوگا ''ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا'' فحش خطا اور فحش غلطی (۱۳۰، ۱۳۲) کے بجائے اردو میں ''فاش غلطی'' مستعمل ہے۔ مصنف نے عموماً حوالوں کا اہتمام کیا ہے، لیکن کہیں کہیں احادیث کے حوالے رہ گئے ہیں، مثلاً عنوان 'قرآن - نقدِ حدیث کا بنیادی معیار' کے تحت متعدد احادیث بلا حوالہ مذکور ہیں (ص ۱۸۴-۱۸۷) ایک جگہ "لا رهبانية في الاسلام" کو بلا حوالہ حدیثِ رسول قرار دیا ہے (ص ۲۰۸) جب کہ ان الفاظ میں یہ حدیث ثابت نہیں ہے (فتح الباری، ابن حجر، دار المعرفۃ بیروت ۹/۱۱۱)

حدیثِ رسول "اللهم أحيني مسكينا و أمتني مسكينا و احشرني في زمرة المساكين" کو علامہ سیوطی کی اللآلی المصنوعة کے حوالے سے موضوع قرار دیا ہے (ص ۲۰۹) یہ حدیث ترمذی اور ابنِ ماجہ دونوں میں مروی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اسے ''غریب'' کہا ہے۔ حاکمؒ نے اسے مستدرک میں روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ متاخرین میں علامہ البانیؒ نے بھی اسے ''صحیح'' کہا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کتاب اپنے موضوع پر قابلِ قدر اضافہ ہے۔ امید ہے، علمی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل ہوگی اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

(م۔ر۔ن)

ثنائیات موطا الامام مالک — مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی

ملنے کا پتہ: جامعہ فیض عام مئوناتھ بھنجن (یوپی)، سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء، صفحات ۱۳۶ (قیمت درج نہیں)

کتبِ احادیث میں مؤطا امام مالک کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ بعض علماء نے اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہے۔ یہ کتاب حدیث کے اولین مجموعوں میں سے ہے۔ اس کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی احادیث کی روایت میں تین سے زائد واسطے نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سی احادیث صرف دو واسطوں سے مروی ہیں۔ بخاری کی ثلاثیات (تین واسطوں سے مروی

احادیث) کوخصوصی اہمیت دی جاتی ہے ،جب کہ موطا میں درجنوں احادیث ثنائی (محض دو واسطوں سے مروی) ہیں۔شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب بستان المحدثین میں موطا کی چالیس ثنائیات کا ذکر کیا ہے۔ اس بنا پر اب تک یہی سمجھا جارہا تھا کہ موطا میں محض چالیس احادیث ہی ثنائی ہیں، مگر زیرتبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے ایک سوترپین (۱۵۳) ایسی احادیث کا استقصاء کیا ہے جوثنائی ہیں۔موطا امام مالک سے متعلق یہ ایک اہم انکشاف ہے۔

فاضل مصنف نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ثنائیات موطا امام مالک کوجمع کرنے کا خیال ان کے دل میں شاہ ولی اللہؒ کی کتاب بستان المحدثین پڑھنے کے بعد ہی آیا تھا۔اس مقصد سے جب انہوں نے موطأ میں ثنائیات کا استقراء وتتبع شروع کیا تو اس میں ایک چہل نہیں ، بلکہ کئی چہل ثنائیات ملیں (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ فروری ۲۰۰۲ء)

''بستان المحدثین'' کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''میرا گمان ہے کہ مولف رسالہ کے پیشِ نظر ثنائیاتِ موطأ امام مالک کا استقصا نہیں رہا ہوگا، بلکہ اربعین کے طرز پر ایک رسالہ لکھنا مقصود رہا ہوگا، اس لئے انہوں نے صرف چالیس ثنائیات کا انتخاب کیا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف ایسی چالیس ثنائیات کا بیان مقصود رہا ہوگا جو بطریق اصح الاسانید مالک عن نافع عن ابن عمر مروی ہیں'' (ایضاً)

زیرِتبصرہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کا پورا نام ہے ''کتاب الاربعینات الجامعۃ لمافی موطأ الامام مالک من الثنائیات أوثنائیات موطأ الامام مالک''۔مقدمہ میں مصنف نے ''اربعین'' اور ''علو اسناد'' کے بارے میں بعض تفصیلات ذکر کی ہیں۔آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں امام مالکؒ اوران کے شیوخ اورشیوخ الشیوخ، جن سے ثنائیات مروی ہیں، کا مختصر ذکر ہے اور موطأ کی بعض امتیازی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مصنف نے اس کتاب کے

مقصدِ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس رسالہ اور اس حقیر کوشش کا اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ جو طلبہ سند و متن کے ساتھ کچھ حدیثیں حفظ کرنا چاہیں گے انہیں یک گونہ سہولت ہوگی''۔ ساتھ ہی حجیتِ حدیث پر سوال اٹھانے والوں کے لیے بھی یہ کتاب مفید ہوگی۔

کتاب میں مذکور احادیث کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ اگر ان کی مختصر ہی سہی، شرح کر دی جاتی تو اس کی افادیت میں اضافہ ہوتا۔ احادیث کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا گیا ہے، لیکن شروع یا آخر میں تفصیلی فہرست کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب کے ذریعے فاضل مصنف نے علمِ حدیث کے میدان میں ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کے لئے وہ قابلِ ستائش ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ عام ہو، خصوصاً عربی مدارس کے طلبہ، جن میں سند و متن کے ساتھ احادیث حفظ کرنے کی روایت تقریباً ختم ہو رہی ہے، اس طرف توجہ کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

(محمد جرجیس کریمی)

اسلامیات — مولانا عبدالبر اثری

ناشر: کوکن پبلیکیشنز ممبئی، سن اشاعت ۲۰۰۳ء، حصہ سوم، صفحات ۱۱۲، قیمت ۲۵ روپے، حصہ چہارم، صفحات ۱۲۰، قیمت ۳۰ روپے

بچے کو کسی چیز کی تعلیم زمانۂ طفولیت میں ہی دے دی جائے تو وہ اس کے ذہن میں پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے اپنے تقاضے ہیں اور اسکول و کالج کی مقررہ نصابی کتابوں کے علاوہ بچوں کو اپنے عقیدہ و دین کی تعلیم دینا ضروری ہے، تاکہ وہ اس پر قائم رہ سکیں اور زندگی کے کسی مرحلے پر اسلام سے منحرف نہ ہوں۔ اس ضرورت کے تحت کوکن ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اسلامیات کا نصاب مرتب کیا جائے۔ زیرِ نظر کتاب کو اسی مقصد سے تصنیف کیا گیا ہے۔ اس سے

قبل اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر دونوں حصے پہلے دو حصوں کے طرز پر مرتب کیے گئے ہیں۔ ان میں قرآن وحدیث کے نصوص مع ترجمہ، عقائد، عبادات، معاشرت، تاریخ اسلام اور دعائیں مع ترجمہ شامل ہیں۔

یہ کتاب اپنے مضامین ومشمولات کے اعتبار سے مناسب اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ اس میں دین کی بنیادی تعلیمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو بچے اس کتاب کو درسیات کے طور پر پڑھیں گے، یقیناً ان کے اندر دین کا ایک واضح تصوّر پیدا ہوگا۔ فاضل مصنف اس پہلو سے قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے مضامین کو فرموداتِ نبوی سے مزیّن کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے حوالے بھی دیے ہیں۔ گاہے بہ گاہے مشہور اردو شعراء کی اسلامی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ضرورت ہے کہ دینی درس گاہوں اور مسلم زیرِ انتظام تعلیمی اداروں کے ذمہ داران اور اساتذہ اس کی طرف توجہ دیں اور اس کی ضرورت وافادیت محسوس کرتے ہوئے اسے داخلِ نصاب کریں۔ (م۔ج۔ک)

گلوبلائزیشن اور اسلام مولانا یاسر ندیم

ناشر: دارالکتاب دیوبند، صفحات ۵۵۶، قیمت: درج نہیں

گلوبلائزیشن یعنی عالمگیریت عصرِ حاضر کا ایک نہایت اہم اور حساس مسئلہ ہے۔ یہ ایک کینسر کی مانند ہے جس نے ہماری معیشت، تجارت، داخلی و خارجی سیاست، عسکری نظام اور بین الاقوامی تعلقات سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ عالمِ اسلام خصوصیت سے اس کی زد پر ہے۔ یہ ابلیسی پنجہ جو کبھی اقوامِ متحدہ، کبھی عالمی بینک، کبھی آزاد اور کھلی تجارت اور کبھی مختلف معاہدوں کے ذریعہ پوری دنیا کو اپنے عالمی شکنجہ میں جکڑ لیتا ہے، دراصل سامراجیت پسندوں کی ایک چال ہے اور پوری انسانیت کو اپنے یہودی کارندوں کی غلامی میں دے دینے کی ایک بھیانک سازش ہے، جس کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔ ۱۹۹۵ء کے آس پاس باقاعدہ

اسے گلوبلائزیشن کا نام دے دیا گیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب اسی اجمال کی تفصیل ہے ۔ لائق مصنف نے پہلے گلوبلائزیشن کی تعریف، اس کی تاریخ اور اس کے لئے راہ ہموار کرنے والے عوامل اور عناصر سے بحث کی ہے اور اسی ضمن میں بلڈر برج، راکفلر فاونڈیشن، امریکی کلیسا کی تنظیم، تعلقات خارجہ کمیٹی (C.F.R.) وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے بعد موضوع کو پھیلاتے ہوئے بتایا ہے کہ گلوبلائزیشن کا دائرہ صرف اقتصادی میدان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک منظم فکری اور نظریاتی حملہ ہے جس میں نہ صرف ہمارا اقتصادی ڈھانچہ نشانہ پر ہے، بلکہ سیاسی، عسکری، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، ہر میدان میں ہم اس کے خونیں پنجوں کا شکار ہیں، گویا یہ ایک عالم گیر فتنہ ہے جو ہر دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

امریکہ، جو اپنا تعارف نام نہاد امن وحریت پسند ملک کے طور پر کراتا ہے، اس کی تاریخ سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے، کہ اس نے مختلف اقوام کو دبانے، کچلنے، ان کی صلاحیت پر قبضہ کرنے اور ان کو غلامی اور استحصال کا شکار بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اور آج تو اس کے دندانِ آز خوب تیز ہو چکے ہیں، چناں چہ عراق اور افغانستان کو غلام بنانے اور وہاں بین الاقوامی جنگی جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد اس کی کینہ توز نظریں اب ایران، شام، لیبیا، اور دوسرے کم زور ممالک پر لگی ہوئی ہیں۔آج ہم اس کی بولی بولنے، اس کے کپڑے پہننے، اس کے بے ذائقہ اور بے لذت ماکولات ومشروبات کھانے پینے اور اس کے ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہیں، کہ یہی ترقی کی شان اور تہذیب کی معراج ہے۔

یہ کتاب انہیں حقائق کی ترجمان ہے۔ اس کتاب کے نوجوان مؤلف کی یہ کاوش کئی پہلوؤں سے مستحقِ داد وستائش ہے جنھیں ان کے استاذ اور معروف صاحبِ قلم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب نے چند لفظوں میں اس طرح سمیٹا ہے:

''موضوع کی ندرت، مواد کی کثرت، تحریر کی سلاست، طرزِ ادا کی حلاوت اور کتاب کی ان شاء اللہ حسنِ اشاعت اور قوتِ افادیت کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ مولوی یاسر ندیم قاسمی دیوبندی کی یہ کتاب کثیر الاشاعت ثابت ہوگی''

ان تمام خوبیوں کے ساتھ چند چیزوں کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ کتاب میں متعدد مقامات پر اقتباسات کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں، مثلاً ملاحظہ کیجئے صفحات ۱۱۲، ۱۲۴، ۱۵۰۔ دوسری چیز یہ کہ طرزِ تحریر پر عربی زبان کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ مصنف نے کتاب کا نوے فیصد مواد عربی کتابوں سے ہی لیا ہے۔ تیسری چیز، جس کی کمی زیادہ محسوس ہوتی ہے، یہ کہ انگریزی مواد سے براہ راست استفادہ کم کیا گیا ہے، جو اس موضوع پر لکھنے کے لئے لازم تھا۔

ان سب کے باوجود کتاب کی افادیت اپنی جگہ ہے۔ اسے ہر اس شخص کے مطالعہ میں آنا چاہئے جو گلوبلائزیشن کے فتنوں سے آگاہی اور اس کے منفی یا مثبت پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو۔

(جاوید احسن فلاحی)

فارسی ادب کا مطالعہ

مترجمہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

ناشر: فاران پبلشرز، مومن اپارٹمنٹس، جوگیشوری، ممبئی، صفحات: ۱۶۸، قیمت: ۱۰۰ روپے

امام خمینیؒ کی قیادت میں ایران کے انقلاب نے جہاں سیاسی، معاشی، ثقافتی اور عسکری میدانوں میں اپنے اثرات مرتب کئے وہیں علمی اور ادبی میدان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ماقبل انقلاب کا ادب اخلاقی گراوٹ، ابتذال، جنسی بے راہ روی، اور اخلاقی پستی پر مبنی اور ایمانیات وعقائد اور مسلمہ تہذیب واقدار کا مذاق اڑانے والا ادب تھا،

جب کہ مابعد انقلاب ادب کی بنیادیں قرآن وسنت پر استوار تھیں اور اس میں چودہ سو سالہ تہذیبی اور فکری روایات سے استفادہ کیا گیا تھا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں انقلابِ ایران کے اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ اس انقلاب نے فارسی ادب کے مختلف اصناف پر کیا اثرات مرتب کئے۔ یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، بلکہ مختلف مقالات کا مجموعہ ہے جنھیں انقلابِ ایران کی سال گرہ کے موقع پر تہران میں منعقدہ ایک سمینار میں پیش کیا گیا تھا۔ اولاً مقالات کو فارسی میں مرتب کر کے شائع کیا گیا، بعد ازاں ممبئی میں خانۂ فرہنگ جمہوریۂ اسلامی ایران کے ڈائرکٹر جناب فرہاد پایزدار کی فرمائش پر ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ نے اس کے بعض مقالات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

کتابت کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ فارسی اشعار کے ترجمے بھی غائب ہیں۔ کہیں کہیں رسم الخط بھی فارسی کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مقالہ نگاروں کے بیانات میں ابہام، غموض اور مبالغہ آمیزی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر احمدی نے لکھا ہے: ''اس قسم کا ادب سیکولرزم کے نام پر پیدا ہوا، جو مشروطیت سے پہلے اس ملک میں وارد ہوا'' (ص ۱۵) اس میں مشروطیت سے کیا مراد ہے؟ یہ واضح نہیں ہے۔ اسی مقالہ میں ایک جگہ ہے: ''اس قسم کا ادب دنیا کے کسی خطہ میں نہیں پایا جاتا''۔ ظاہر ہے کہ یہ مبالغہ ہے، بلکہ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کا ادب دنیا کے ہر خطہ میں پایا جاتا ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ ڈاکٹر شاہد چودھری کے مقالہ میں ہے: ''اسی لئے اس اسلوب کو ''سبک اقبال'' کا نام دیا گیا ہے'' (ص ۵۳) پتا نہیں یہ اقبال کا کون سا اسلوب ہے؟ ایک جگہ امام خمینی کی مدح میں لکھا گیا ہے: ''ان کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی کی مانند ہمیشہ ایسا ہی ادب وارد ہوتا تھا''۔ ظاہر ہے، یہ الفاظ انبیائے کرام کے لیے مخصوص ہیں۔

اس طرح کے لفظی ومعنوی تسامحات اس کتاب میں بہت زیادہ ہیں۔ اگلے ایڈیشن میں (اگر اس کی نوبت آئے) انہیں درست کر لینا چاہیے۔

(ج۔ا۔ف)

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

☆ ''مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ'' صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی مقبولِ عام کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع سے بحث کرتی ہے۔ اس میں ان حقوق پر گفتگو کی گئی ہے جو اسلام نے عورت کو مرحمت کئے ہیں اور ان اعتراضات، شبہات اور غلط فہمیوں کا بھرپور علمی جائزہ لیا گیا ہے جو اس سلسلے میں کئے جاتے ہیں۔ اب تک ہندو پاک میں اردو اور انگریزی میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت بعض مباحث میں خاطر خواہ اضافے کیے ہیں۔

صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۸۰/روپے

☆ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے مولانا عمری کی ایک کتاب ابھی کچھ عرصہ قبل ''غیر اسلامی ریاست اور مسلمان'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ دین کے وہ بنیادی مطالبات کیا ہیں جن پر ایک مسلمان کے لئے ہر جگہ اور ہر حال میں عمل کرنا ضروری ہے؟ اور غیر اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اسے کس کردار کا مظاہرہ کرنا چاہئے؟

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ صفحات: ۴۸ قیمت: ۱۵/روپے

☆ مولانا عمری کا ایک کتابچہ ''بعض اہم اسلامی اصطلاحات اور ان کی تشریح''

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے پہلے شائع کیا تھا۔ اس میں موجودہ حالات کے پس منظر میں ایمان، اسلام، مسلمان، کفر، کافر، جہاد، دارالاسلام، دارالحرب، جزیہ اور نسخ جیسی اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ صفحات: ۲۸، قیمت: ۱۲؍روپے۔ اب اس کا مراٹھی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔

☆ مولانا عمری گزشتہ کئی برس سے مسجد اشاعت اسلام، دعوت نگر، نئی دہلی میں خطبات جمعہ وعیدین دیتے ہیں۔ لوگ دُور دُور سے ان خطبات کو سننے کے لئے آتے اور اپنی دینی وعلمی پیاس بجھاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خطبہ ''آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچایئے'' کے عنوان سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے شائع کر دیا ہے۔

صفحات: ۱۶ قیمت: ۱۰؍روپے

☆ ادارۂ تحقیق کے علمی منصوبہ کے تحت تیار ہونے والی، رکنِ ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی نئی کتاب ''حقائقِ اسلام۔ بعض اعتراضات کا جائزہ'' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔ اس میں ہندوستان کے پس منظر میں غیر مسلموں کی جانب سے قرآن، سیرتِ رسول، عبادات، معاشرت، تہذیب اور دیگر پہلوؤں پر کیے جانے والے اعتراضات کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: ۲۱۶ قیمت: ۵۰؍روپے

☆ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ''حقیقتِ کفر'' کے عنوان سے بھی ایک کتابچہ تیار کیا ہے۔ اس میں لفظ کفر کی لغوی واصطلاحی تشریح، کافروں کا اخروی انجام، ان کے ساتھ دنیاوی معاملات سے متعلق احکام اور ان کے متعلق بعض قرآنی آیات کا صحیح مفہوم جیسے عنوانات کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔ صفحات تقریباً ستّر۔ ادارۂ تحقیق کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت انشاء اللہ جلد شائع ہو جائے گی۔

☆ ادارۂ تحقیق کا شعبۂ تصنیفی تربیت بعض ناگزیر اسباب سے، جن میں ایک اہم

سبب مالیات کی عدم فراہمی ہے، ادھر کچھ عرصہ سے کام نہیں کر رہا تھا۔ بعض اصحابِ خیر کی دلچسپی سے اس کی سرگرمی پھر شروع ہوگئی ہے۔ انٹرویو کے بعد دو فارغینِ مدارس کا انتخاب کرلیا گیا ہے۔ ادارہ ایسے زیرِ تربیت افراد کو رہائش کی سہولت فراہم کرنے کے ساتھ حسبِ وسع اسکالرشپ بھی دیتا ہے۔ اس پروگرام کو کامیابی اور یک سوئی کے ساتھ چلانے کے لئے علم نواز اور اصحابِ خیر حضرات کی توجہ درکار ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

ہندوستان کے پس منظر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں، یہ موضوع کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لئے کہ فرقہ پرستوں نے اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں، مثلاً انھوں نے یہ پروپیگنڈا کیا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو موجبِ گردن زنی قرار دیتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری اور توسع نہیں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی مذہبی آزادی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاشرتی، معاشی اور سیاسی تعلقات پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف کے جان دار اور رواں دواں قلم نے سلیس اور دلکش اسلوب میں پیچیدہ مسائل کی گتھی سلجھائی ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب، دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک اہم ضرورت

آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات: ۳۳۲ قیمت (مجلّد) =/۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی
انگریزی مطبوعات

		صفحات	قیمت
	از مولانا صدر الدین اصلاحی		
۱	**Islamic Civilization in its Real Perspective**	۱۳۸	۹۰روپے
۲	**How to Study Islam?**	۲۲	۲روپے
۳	**Pitfalls on the Path of Islamic Movement**	۳۴	۴روپے
۴	**The Islamic Economic Order**	۵۰	۷روپے
۵	**Muslims and Dawah of Islam**	۲۸	۲روپے
	از مولانا سیّد جلال الدین عمری		
۱	**Woman and Islam**	۱۰۴	۲۵روپے
۲	**Muslim Women: Role and Responsibilities**	۶۴	۲۰روپے
۳	**The Rights of Muslim Women: An Appraisal**	۲۳۴	۷۰روپے
۴	**The Concept of Social Service in Islam**	۱۶۵	۵۰روپے
۵	**Islam and The Unity of Mankind**	۳۶	۷روپے
۶	**Islam: The Religion of Dawah**	۳۲	۳روپے
۷	**Islam: The Universal Truth**	۲۲	۳روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر:۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵